اپریل 60

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۳۰

جلد ۵۳ عدد ۹

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۳ | ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء | عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ

لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

مذہب و سائنس کی باہمی آویزش کی اندوہناک داستان اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس دلفگار حادثہ سے ملتی جلتی ہے جسے فردوسی نے اپنی زندہ جاوید کتاب شاہنامہ میں قلمبند کیا ہے۔ دونوں آمادۂ جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر۔ اگر وہ ایک دوسرے کو بروقت پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ اہم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی۔

پھر جس طرح رستم و سہراب کے معاملے میں راز افشا ہونے پر رستم نے افراسیاب کے پاس دستگیری کی درخواست کی لیکن اُس کی ذاتی مصلحتیں اُس کے احساسِ مروہ کو جگا نہ سکیں بالکل اسی طرح اب جبکہ اہلِ سائنس اور اہلِ مذہب ایک دوسرے کو سمجھ چکے ہیں اور انہیں اس بات کا یقین آچکا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ دمساز رفیق اور دوست ہیں تو عین اس وقت بھی عصرِ حاضر کے افراسیاب ان دونوں کو گلے نہیں ملنے دیتے اور اس امر کے لیے برابر کوشاں ہیں کہ کسی طرح ان کے درمیان بیگانگی قائم رہے تاکہ اُن کی سطوت و شوکت میں کوئی خرق نہ آنے پاتے۔

آج سے پانچ سو برس پیشتر جب مسلم فاتحین نے یورپ میں قدم رکھا تو اہلِ یورپ کی عقل و خرد کو مہمیز لگی اور انہوں نے کائنات کے بارے میں سوچنا اور غور کرنا شروع کیا۔ بیداری کی یہ لہر اپنے نتائج کے لحاظ سے دنیا کے لیے بڑی مفید اور کارآمد ہوتی اگر یورپ

کیتھولک پادری اس کا راستہ روکنے کی حماقت نہ کرتے۔ اس سے انسانی عقل کے جمود وارتقاء پر جو فضول بندشیں اور پابندیاں عائد تھیں وہ دور ہوتیں اور انسان ایک بہتر اور شاد کام زندگی گزارنے کے قابل ہوتا مگر افسوس کہ ان مذہبی پیشواؤں نے کچھ تو اُس تحریف کی وجہ سے دھوکا کھا کر جس نے تورات و انجیل کی سماوی اصلیت کو پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا تھا، کچھ اُس جہالت کے اشتغال سے جو قرنہا قرن سے ان پادریوں کا سرمایۂ امتیاز بنی ہوئی تھی اور کچھ اُن سیاسی ضرورتوں سے مجبور ہو کر جنہوں نے اُن کے دین کو دنیا داری میں تبدیل کر دیا تھا اُن باتوں میں بھی دخل دینا شروع کر دیا جن سے انہیں کوئی علاقہ اور سروکار نہ تھا۔

عوام کے لیے ان مذہبی رہنماؤں کی یہ جسارت کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہ ہوتی اگر یہ حضرات کچھ مزید حماقتیں نہ کرتے۔ جب یہ لوگ سائنس کے میدان میں اترے تھے تو اُن کا فرض تھا کہ یہ سائنس دانوں ہی کی طرح اپنی تحقیقات اور انکشافات لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور جو کچھ کہتے تجربات اور مشاہدات کو اس پر گواہ بناتے لیکن انہوں نے اپنے اُس بلند و بالا مقام کے زعم میں جو انہیں معاشرہ میں حاصل تھا، سائنس کے مسائل پر بھی ملہم من اللہ کی حیثیت سے رائے زنی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ حقائقِ فطرت کے متعلق جب انسان کو صحیح صحیح علم ہُوا تو ان مذہبی رہنماؤں کے دعاوی اور من گھڑت تصورات جنہیں الہام سے کوئی لگاؤ نہ تھا باطل ہو گئے اور اُن کے پیرو اُن کو جھوٹا سمجھ کر کفر و الحاد کی طرف جھک گئے اور مغربی دنیا بڑی حد تک مذہب کی قید سے آزاد ہو گئی۔

اگر معاملہ صرف اس حد تک ہی محدود رہتا تب بھی کچھ بہت زیادہ تشویشناک نہ تھا۔ لیکن اہلِ کلیسا کی مزید حماقتوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ یہ لوگ وقتی فائدہ اور نقصان میں اتنے الجھ چکے تھے کہ اپنی خلافِ عقل حرکات کے دُور رس نتائج کی طرف سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ہر نئی آواز کو بلا سوچے سمجھے دبانا شروع کر دیا اور اس نئی تحریک کا راستہ روکنے کے لیے وہ حربے استعمال کیے اور اتنی سختیاں کیں کہ ان کے تصور سے آج بھی جسم و روح دونوں

کانپ جاتے ہیں۔ مذہبی عدالتیں قائم ہوئیں جن میں ان "باغیوں" کو عبرتناک سزائیں دی گئیں۔ اندازہ ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں پر عتاب نازل کیا اُن کی تعداد کسی طرح بھی تین لاکھ سے کم نہیں ان میں سے بیس ہزار کو زندہ جلا دیا گیا، انہی زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت و طبیعیات کا مشہور عالم برونو بھی تھا جس کا سب سے بڑا جرم ارباب کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرہ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل ہے۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا قائل تھا۔

اہلِ کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں نے یورپ میں مذہب کے خلاف نفرت کی ایک عام لہر دوڑا دی اور لوگ بڑی سرعت کے ساتھ مذہب سے بغاوت کرنے لگے۔ اور وہ جنگ جو شروع شروع میں تنگ نظر اور عیاش قسم کے اہلِ کلیسا کے خلاف لڑی جا رہی تھی وہ بعد میں عیسائی مذہب کے خلاف شروع ہو گئی اور اس کے بعد ہر مذہب کے خلاف۔ مذہب کے ان باغیوں نے وقتی جوش اور ہیجان میں اتنا سوچنا بھی گوارا نہ کیا کہ ان اربابِ کلیسا کی حماقتوں کا خود مذہب سے کہاں تک تعلق ہے۔ یہ ہیں وہ اصل حالات جن میں پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس میں چڑ اور ضد نے اربابِ کلیسا کے خلاف جذبات کو بڑے ہی غلط راستوں پر ڈال دیا۔ اس نئی تحریک کے علمبرداروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو اس بنیاد پر کھڑا کرنا چاہا کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ صرف مادہ ہے۔ نمو، حرکتِ ارادی، احساس، شعور اور فکر سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو قوانینِ طبیعی کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور ترتیب پاتے ہیں اسی قسم کے افعال ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ تہذیبِ جدید کے معماروں نے اسی بنیادی فلسفہ کو سامنے رکھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کی اور اس کا آغاز اس مفروضہ سے کیا گیا کہ کوئی خدا نہیں، کوئی الہامی ہدایت نہیں، کوئی

واجب الاطاعت نظام اخلاق نہیں، کوئی حشر نہیں اور کوئی احتساب و جوابدہی نہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان سب کے سب قوانین طبیعی کے پابند ہیں۔

مغرب کا نیا انسان بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ اور اس عزم کے ساتھ میدان میں اترا کہ وہ زندگی کے سارے مسائل کو قوانینِ طبیعی کی مدد سے نہایت کامیابی سے حل کر لیگا۔ چنانچہ اُس نے سب سے پہلے انسان کو اس بات کی ترغیب دینا شروع کی کہ یہ حشر و نشر، اخلاق اور خدا پرستی سب اعتباری باتیں اور دورِ جہالت کی یادگار ہیں۔ اس لیے اُسے سب سے پہلے انہیں اپنے دل و دماغ سے محو کر دینا چاہیے۔ اُس کی طبیعت جس بات کا تقاضا کرے، اُس کا نفس جس چیز کا مطالبہ کرے اُس کے پورا کرنے میں کوئی شے بھی مانع نہ ہونی چاہیے۔ مصنفین اور اہلِ قلم نے قلم کے زور سے، سوچنے اور سمجھنے والے دماغوں نے فلسفہ کی مدد سے، اور اہلِ خطابت نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زورِ خطابت سے قدیم مذہبی رسوم اور قیود کے خلاف ملک میں نفرت اور بغاوت کی ایک عام فضا پیدا کر دی۔ انہوں نے دنیا پرستی کو نہایت ہی دلفریب بنا کر پیش کیا، جو چیز اس کی راہ میں حائل ہوئی اس کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکایا اور اس طرح طبیعتوں کو ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کو زندگی سے بھرپور تمتع، مطالباتِ نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ حرص و آز کی اس زندگی کی اہمیت جتانے میں بڑے غلو سے کام لیا گیا۔ نقد لذت اور ظاہری اور محسوس مادی نفع کے سوا ہر چیز کا ابطال کیا گیا۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے کسی بلند تر اخلاقی مقصد کے تحت زندگی بسر کرنے کی بجائے صرف جبلتوں کی تحریک اور اُن کی رہنمائی میں سفرِ حیات کا آغاز کیا اور اسی کو انسانیت کی معراج سمجھنے لگا۔

عین اسوقت جب انسان اس احمقانہ مہم پر نکلنے کے لیے رختِ سفر باندھ رہا تھا قدرت

اُس کی اس حماقت پر خندہ زن تھی اور زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ یہ بے راہ روی کی زندگی اور جبلتوں کی یہ بے قید پرستش تیری فطرت کے عین منافی ہے اور تو اس حالت میں ایک لمحہ بھی گزار نہیں سکتا۔ لیکن انسان نے وقتی جوش میں آکر قدرت کے ان خاموش اشاروں سے صرفِ نظر کیا اور قوانینِ طبیعی کو مشعلِ راہ بنا کر ان کی روشنی میں اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اس کی یہ جدوجہد چونکہ فطرت کے خلاف کھلا چیلنج تھی اس لیے اسے قدم قدم پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ہر گام پر ٹھوکر کھائی۔ قدرت نے ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ ہر ہر منزل پر نہایت تلخ نتائج سے اُسے دوچار کر کے اس کے لیے سامانِ عبرت مہیا کیا۔ لیکن انسان نے ان سب چیزوں سے مجرمانہ تغافل برتا اور اپنی روایتی لاپروائی کے ساتھ انحطاط کی طرف مسلسل بڑھتا رہا۔ یہ چیز غالباً انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ جب ایک مرتبہ بربادی کی طرف لڑھکتا ہے تو پھر کوئی آواز، کوئی نصیحت اُس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ اس کی آنکھیں پھر انحطاط کی آخری حد تک پہنچنے کے بعد ہی کھلتی ہیں۔

انحطاط کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اُس کے چھا جانے کے بعد ایک فرد اور قوم کے اندر ایک عجیب و غریب قسم کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو اسے قدم قدم پر پریشان کرتا ہے۔ اس تضاد سے بلاشبہ فرد اور معاشرے کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے لیکن اس کا وجود کسی قوم کے لیے بڑا ہی غنیمت ہوتا ہے۔ یہ تضاد خطرے کا وہ نشان ہے جو حساس اقوام کو چونکاتا ہے اور انہیں اُس خطرہ سے آگاہ کرتا ہے جس کی آغوش میں وہ بڑی تیزی سے جا رہی ہوتی ہیں۔

اہلِ مغرب جب کفر اور الحاد کی راہوں پر چلنے لگے تو انہوں نے سب سے پہلے اس بات کا

فیصلہ کیا کہ وہ اب کسی مذہب کی پیروی نہیں کریں گے لیکن قدرت نے اُن سے ایسے ایسے ظالمانہ نظاموں کی پیروی کرائی جن کا کوئی شخص اُس وقت تک وہم و گمان بھی نہ کر سکتا تھا۔

پہلے ہی قدم پر جو اُلجھن انہیں پیش آئی وہ یہ تھی کہ وہ اپنی جبلتوں کی بالکل آزادانہ طور پر تسکین کرنا چاہتے تھے۔ لیکن خود ان کی اپنی شخصیت اس راہ کا سب سے بڑا سنگِ گراں ثابت ہوئی۔ جبلتوں کی بے قید تسکین تو جانوروں کا شیوہ ہے جن میں کوئی شعور و آگہی یا ارادہ و اختیار نہ ہو۔ مگر انسان اس موقف کو اختیار کر کے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی معاشرتی زندگی قائم نہیں رکھ سکتا۔ انسانی شخصیت کا استحکام اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ عمل کے تنوع میں کسی متحد کرنے والے حقیقت کے نقطہ کو معلوم کرنے کی کوشش کرے جس سے تعدد و تنوع میں ہم آہنگی پیدا ہو اور زندگی ابن الوقتی اور بے اصولے پن کی بھول بھلیاں میں پھنسنے نہ پائے۔ انسان کی یہ تلاش دراصل اُس کے روحانی جذبہ کا بالکل فطری تقاضا تھا جو اُسے بار بار اس بات کی طرف متوجہ کر رہا تھا کہ وہ ان منہ زور جبلتوں کو کسی بلند و بالا مقصد کے پیش نظر کنٹرول کرے۔

اس کے بعد دوسرے قدم پر اُس کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر اُسے اپنی ان بپھری ہوئی قوتوں کو کسی بالاتر مقصد کا پابند ہی بنانا ہے تو وہ مقصد کیا ہو؟ خدا کی رضا جوئی تو اُس کے نزدیک محض فریبِ نظر اور جہالت کی یادگار تھی جسے وہ کسی صورت میں بھی اپنانے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے اُس نے یہ مقصد بھی مادی دنیا ہی میں متعین کیا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی ان قوتوں کو اگر آزادانہ استعمال نہیں کر سکتا اور اجتماعی تقاضوں کے پیش نظر انہیں کسی نظام کا پابند بنانا بھی ناگزیر ہے تو پھر اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ ان کی اس طرح سے منصوبہ بندی کرے جس سے ملک اور قوم کو زیادہ سے زیادہ مادی فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ اُس نے اشتراکِ زبان، اشتراکِ نسل اور اشتراکِ وطن سے ریاست کی شکل میں اپنا ایک ایسا معبود تیار کیا جس کے قدموں میں اُس نے اپنی ہر قیمتی سے قیمتی چیز کو لا ڈالا۔ اُس کے ساتھ اس

تعلق کی نوعیت بالکل وہی تھی جو ایک خدا پرست انسان کو اپنے خالق اور مالک کے ساتھ ہوتی ہے۔ اُس کا جینا اور مرنا صرف ریاست کے لیے مخصوص ہوگیا۔ اُس نے اگر مانگا تو اُسی سے مانگا اور وہ اگر جھکا تو صرف اُسی کے سامنے جھکا اور اس طرح وہ مملکت جو محض اعتباری اور مجازی طور پر منقدر ہے اس میں اس آزادی پسند انسان نے الوہیت کی شان پیدا کر لی۔ دوسرے لفظوں میں جس خدا سے نجات پانے کے لیے اُس نے اتنے ہاتھ پاؤں مارے تھے اُسے تو اُس نے بلاشبہ روزمرہ کے معاملات سے بے دخل کر دیا لیکن اپنے ذہن سے احساسِ عبودیت کو مٹا نہ سکا اور اسی کے تقاضوں نے اسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مملکت کے پیکرِ محسوس کو کبریائی کے مقام پر رکھ کر اُس کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ اس سے بڑا تضاد اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ انسان جو خالق اور مالک کی فرمانروائی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا وہ آج دیوانہ وار اپنے آپ کو ریاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔

ممکن ہے ہماری ان گزارشات کو دیکھ کر کوئی صاحب یہ کہیں اب تو انسان رنگ و نسل و وطن کی حدود سے باہر نکل کر انسانیت کی وسیع سطح پر سوچ رہا ہے۔ اس لیے ہمارا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم اسی قدر گزارش کریں گے کہ انسان کی انسانیت نوازی کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے کے لیے یہ دیکھیے کہ فکر و نگاہ کی اس تبدیلی کے محرکات کیا ہیں۔ کیا انسان نے مادی فوائد سے بلند ہو کر انسانیت کی تعمیرِ نو کا منصوبہ بنایا ہے؟ جب کوئی انسان اس نقطۂ نظر سے حالات کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمین کے مختلف گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں اور اب پوری دنیا ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ معاملہ صرف تسخیرِ مکان کی حد تک ہی محدود ہے۔ اس تبدیلی نے انسان کے اذہان و قلوب کے اندر کسی قسم کا کوئی خوشگوار انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جغرافیائی حد بندیوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے اُس نے

اب تہذیب و معاشرت کی بنیاد پر وسیع ترجمہ بندیوں کا پروگرام مرتب کیا ہے لیکن اُس کے اس پروگرام کے اجزائے ترکیبی بالکل وہی ہیں جو پہلے تھے۔ یہاں بھی اُس کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے اور اپنے دھڑے کے لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مالی منفعتیں حاصل کرے۔ مادی وسائل و اسباب جمع کرنے کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں۔ اس صورتِ حال نے اُسے ایک شدید قسم کے تضاد میں گرفتار کر دیا ہے۔ آج کا انسان ایک طرف مسخرِ کائنات کے منصوبے بنا رہا ہے اور اپنے صنعتی کمالات و عجائبات اور مادی و طبیعی قوتوں سے کام لینے کے معاملے میں وہ مافوق البشر ہے مگر دوسری طرف اپنے اخلاق و اعمال میں اور اپنی حرص و طمع، سنگ دلی اور بے دردی میں اس کی سطح چوپایوں اور درندوں کی سطح سے کسی طرح بھی بلند نہیں اور بقول ایک مشرقی فلسفی اُس نے ہوا میں اڑنا تو سیکھ لیا ہے لیکن اُسے زمین پر چلنا نہیں آیا۔

فکر و عمل کے اس کھلے ہوئے تضاد نے اُس کی زندگی کو ایک عجیب و غریب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ایک طرف دولت کی فراوانی اور کثرت ہے مگر دوسری طرف افلاس اور عسرت کے ایسے روح فرسا واقعات بھی ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر انسانی عقل یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی کہ نوعِ بشری نے ایک قدم بھی ترقی کی راہ پر اٹھایا ہے۔ اخبارات میں آئے دن نئے نئے معاہدات کی خبریں آتی ہیں اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ انسان اب جنگ و جدال کو خیرباد کہہ کر ایک پُرامن زندگی اختیار کرنے کے لیے بیتاب ہے اور عنقریب اُس کی یہ آرزو پوری ہو جائے گی۔ لیکن عین اُس وقت جب وہ امن کی قسمیں کھاتا ہے اور جنگ نہ کرنے کے عہد و پیمان باندھتا ہے وہ دل ہی دل میں یہ بھی سوچتا ہوتا ہے کہ فریق مخالف کو کس طرح تباہ و برباد کیا جائے۔ اس طرح بین الاقوامی امن کی ساری کوششیں سیاسی مکر و فریب اور بدعہدیوں میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پوری دنیا کو کنٹرول کرنے والا انسان

اپنی ایک معمولی سی خواہش کو کنٹرول کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

اہلِ مغرب چونکہ سائنس ہی کو وہ کلید سمجھتے ہیں جس سے اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے باب خود بخود کھل سکتے ہیں۔ اس لیے مغربی مفکرین نے جب کبھی اپنی سیاسی اور معاشی زندگی کے اس کھلے ہوئے تضاد کو دیکھا تو انہوں نے قوانینِ طبیعی ہی سے معاشرتی اور اخلاقی قوانین اخذ کرکے انسان کی خارجی زندگی میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی، جو ان کی داخلی کیفیات کو ان کے خیال میں بدل دینے کی قدرت رکھتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ خارجی نظام مثلاً نظامِ حکومت، نظامِ معیشت یا نظامِ تعلیم انسانی کردار و افعال پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں لیکن جب تک انسانی ضمیر اور انسان کے باطنی محرکات میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو خارجی نظام کی تمام طاقت و اثر فرمائی رائیگاں ثابت ہوتی ہے۔ اصلی اور حقیقی انقلابِ حال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب زندگی کے متعلق انسان کا مجموعی نقطۂ نظر بدل جائے۔ نیکی اور خیر کی طرف میلان کوئی ایسی چیز نہیں جسے خارج سے عائد کردہ نظام کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہو۔ لیکن قوانینِ طبیعی کے پرستار انسان نے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے حق و انصاف، مساوات اور راست کرداری پیدا کرنے کے لیے بھی خارجی محرکات پر تکیہ کیا۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم پر جب اُس کے دل نے خون کے آنسو بہائے اور اُس نے اِس لعنت کو دنیا سے ختم کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے اُس نے جو تدابیر اختیار کیں وہ بالکل ادھوری اور ناقص ہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہوتے ہی انسان کے فکر و نگاہ کے زاویے از خود بدل جائیں گے اور صرف دولت کی مساوی تقسیم انسان کو انصاف پسند اور راست کردار بنا دے گی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اس آزاد منش انسان کو جو مذہب کی معمولی سے معمولی گرفت بھی گوارا نہ کرتا تھا اور اپنی نفسانی خواہش پر کسی قسم کی پابندی عائد

کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا اُسے ایک ایسے قاہرانہ اور ظالمانہ نظام کے حوالہ کر دیا ہے جس نے نہ صرف معاشرے میں تقسیمِ دولت اور پیدائش دولت کی منصوبہ بندی کی ہے بلکہ اُس کے جذبات اور میلانات تک کو جکڑ کر رکھ دیا ہے۔ جو نظامِ حیات پولیس اور فوج کی مدد سے لوگوں کے احساسات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کا عزم رکھتا ہو اُس کی قہرمانیوں کا آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اس نظام کو برپا کرنے والے اور چلانے والے وہ لوگ ہیں جن کا مزاج ہوس پرستی کے خمیر سے اٹھایا گیا ہے اور اس پر وہ کسی پابندی کے بھی قائل نہیں۔

اشتراکی ممالک کے برعکس سرمایہ دارانہ ممالک میں دولت کی اس غیر منصفانہ تقسیم کا علاج ضبطِ ولادت کی صورت میں سوچا گیا۔ وہاں کے مفکرین نے سب سے پہلے انسان کے ذہن میں اس باطل خیال کی آبیاری کی کہ قدرت انسانوں کے ساتھ ایک شرمناک کھیل کھیل رہی ہے یعنی وہ جتنے زیادہ انسان پیدا کرنے کا سامان مہیا کرتی ہے اتنے اسبابِ رزق فراہم نہیں کرتی۔ اس نظریہ کی تائید کے لیے فوراً سائنس آگے بڑھی اور اُس نے زمین کے اندر قانونِ تقلیلِ حاصل کی فرمانروائی ثابت کر دی۔ خود سائنس کی ایجادات و انکشافات نے اس نظریہ کا جس طرح ابطال کیا ہے وہ ایک دوسری بحث ہے لیکن جدید انسان اسی نظریہ کو بنیاد قرار دے کر انسانی فلاح کی اگر کوئی صورت دیکھتا ہے تو وہ صرف ضبطِ تولید ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری تدبیر اُس کی نظر میں موثر اور مفید نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس معاملے میں بھی وہ اپنے آپ پر کوئی پابندی عائد کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا وہ اس بات کے لیے برابر کوشاں رہا ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے اُسے آزاد شہوت رانی کے مواقع بھی میسر رہیں اور وہ اولاد کی ذمہ داریوں سے بھی بچ جائے۔ چنانچہ سائنس ہی نے

اس کی دستگیری کی اور اسے ایسی مصنوعی تدابیر سے آشنا کیا جن کو کام میں لا کر وہ بڑی آزادی کے ساتھ شہوانی لذت بھی حاصل کر سکتا ہے اور اولاد کے بوجھ سے بھی اپنے آپ کو مامون و محفوظ رکھ سکتا ہے۔

سائنس نے اس کی اس الجھن کو کسی حد تک سلجھا دیا ہے لیکن وہ اس کی زندگی کے تضاد کو دور نہیں کر سکی۔ اولاد والدین کے لیے بار اور لعنت نہیں ہوتی بلکہ نعمت اور رحمت ہوتی ہے۔ اولاد کی خواہش اور اس سے محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس فطری جذبہ کی تسکین کا اگر جائز اور صحیح انتظام نہ کیا جائے تو پھر اس سے دوسری خباثتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ یورپ کے لوگ نسلِ آدم کو تو ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھ کر اُسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے لیکن اولاد سے محبت کی اس فطری امنگ کو کتے اور بلیاں پال کر پورا کرتے ہیں۔ یورپ کا انسان اس قدر "صاحبِ نظر" واقع ہوا ہے کہ اپنے لختِ جگر کے بوجھ کو اٹھانے سے تو وہ ہچکچاتا اور پس و پیش کرتا ہے لیکن کتوں اور بلیوں کے بار کو بڑے ذوق و شوق سے قبول کر لیتا ہے۔ یہ ہے اس کی فکری بلندی کی انتہا۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب جنہیں انگلستان میں ایک لمبی مدت گزارنے کا موقع ملا ہے انہوں نے انگلستان میں کتے کے معاشرتی مقام پر ایک نہایت ہی حقیقت پسندانہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ ہم یہاں اُس کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے اس بات کا آسانی کے ساتھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب کوئی قوم اپنی جبلت کی تسکین کے لیے غیر فطری روش اختیار کرتی ہے تو اسے کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

> "اب جو کھڑے کھڑے میں نے ذرا فرصت سے کمرے کو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ایک لاڈلے کتے کا فوٹو چوکھٹے میں سجا ہوا دیوار پر آویزاں پایا۔ دوسری طرف ایک اور کتے کی پینٹنگ بہار دے رہی تھی۔ یہ پینٹنگ مسز مائیلنڈ کی نقاشی کا اچھا نمونہ پیش کرتی تھی۔ اس معاینے کے بعد میں صوفے پر بیٹھنے کے لیے مڑا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک مخملی

پوستین والا پلا بڑے مزے سے سو رہا ہے۔ مَیں نے اس کے آرام میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور آتش دان کے پاس ایک مسند نما نشست پر جا بیٹھا۔ اتنے میں لزلی مائیلنڈ بتقاضائے مہمان نوازی نیچے کا کام سمیٹ کر مجھ سے باتیں کرنے کے لیے اوپر چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ لزلی مائیلنڈ کو سوتے ہوئے پلّے سے کوئی تکلف نہ تھا۔ انہوں نے آتے ہی اُسے اُٹھایا اور اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ یہاں تک بھی خیریت تھی مگر جب انہوں نے کتّے کو سینے سے لگائے اُس کا منہ بھی چُوم لیا تو میں دل ہی دل میں پکار اُٹھا یا للعجب!...

... میں ابھی اسی حیرت میں تھا کہ لزلی مائیلنڈ کتّے کو گود میں لیے صوفے پر آبیٹھے اور اپنے فہمیدہ اور پُرخلوص دوستانہ انداز میں مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد ہر شام یہی صورت پیش آتی تھی۔ لزلی مائیلنڈ اور میں آگ کے سامنے بیٹھ کر دیر تک اپنا دکھ سکھ ایک دوسرے سے کہتے۔ اس وقت کوئی نہ کوئی کتا میرے انگریز دوست کی گود میں ہوتا۔ وہ اسے تھپکتے، گلے لگاتے، اس کا مُنہ چومتے اور ساتھ ساتھ پوری سنجیدگی سے میری اور اپنی ذاتی زندگی کی آرزوؤں اور حسرتوں پر تبصرہ کرتے چلے جاتے۔ کتّے اور انسان کا یہ پیار محض تفنّن نہ تھا۔ دونوں طرف سے سچی محبت کا اظہار ہوتا تھا دونوں گلے ملتے، منہ چومتے، اور ناک سے ناک رگڑتے تھے۔ مسز مائیلنڈ بھی اپنے کتّوں سے اسی محبت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ کرسمس کی شام کو ہم سب آگ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران میں مٹھائی کا ایک ڈبّہ کھولا گیا۔ پہلے مسز مائیلنڈ نے ایک ٹکڑا نکالا اور چکھا۔ اس وقت ایک کُتیا نے جو پاس بیٹھی تھی۔ بڑی تمنا سے مٹھائی کی طرف دیکھا۔ مسز مائیلنڈ نے فوراً مٹھائی کا ایک لقمہ اس کے منہ میں دے دیا اور انگلیاں خود چاٹ لیں۔

مجھے دوران قیام میں معلوم ہوا کہ یہ سب بلیاں اور کتّے مائیلنڈ گھرانے کی اپنی ملکیت نہیں۔ گھر میں ان جانوروں کی کثرت کا ایک اور سبب تھا۔ اچھے طبقے کے

انگریز جب بغرض سیر و سیاحت یا بوجہ ضرورت ملک سے باہر جاتے ہیں تو ذمہ دار والدین کی طرح اپنے پالک چوپایوں کے رہنے سہنے کے لیے کوئی شریف گھرانا تلاش کرتے ہیں اور ان کے قیام و طعام کے لیے معقول معاوضہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ہم اپنے بچوں کے لیے اتالیق کی ضرورت کا اشتہار دیتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی اخبار کتوں کی خبرگیری کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً دونوں طرف کے ضرورت مندوں (یعنی کتوں کو چھوڑ کر جانے والوں اور اُجرت پر خبرگیری کرنے والوں) کی طرف سے اشتہار شائع کرتے ہیں۔ مائیلنڈ گھرانے کے اکثر جانور اسی قسم کے اُجرت دینے والے مہمان تھے۔ آپ کو شاید شبہ ہو کہ کتوں سے یہ سلوک و محبت مسٹر اور مسز مائیلنڈ کا کوئی خصوصی کمال تھا۔ لیکن آپ کا یہ حسنِ ظن انگلستان کی پوری آبادی سے ایک ظلم ہوگا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ایسا خیال ایک بین الاقوامی بے انصافی کا درجہ رکھیگا۔ میرے پاس اس دعوے کے کئی معقولی اور منقولی ثبوت، کئی عینی اور قرائنی شہادتیں ہیں کہ کتے اور انسان کا بھائی چارہ انگلستان کے مزاج میں راسخ ہو چکا ہے۔ اس میں امیر اور غریب یا عامی و فلسفی کے درمیان کسی قسم کی تمیز ناممکن ہے۔

پھر اس ضمن میں یہ چیز بھی ملحوظ خاطر رہے کہ انگلستان میں انسان اور کتے کی باہمی محبت کچھ بہت پرانی نہیں بلکہ صنعتی دور کی پیداوار ہے۔ اسی کے متعلق پروفیسر موصوف فرماتے ہیں:

"انگریزی لغت میں "کتا" کے مجازی مفہوم منجملہ اس لفظ کے دوسرے معانی کے دو ہیں۔ ایک مفہوم ہے "کمینہ اور ذلیل شخص"۔ یہ مفہوم بہت پرانا ہے اور دنیا کی اور زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ دوسرا مفہوم ہے "خوش باش آدمی"، "مزے کا آدمی"، "یار دوست"۔ دوسری صورت میں یہ لفظ انسان کے لیے پیار یا دل لگی سے استعمال ہوتا ہے۔ (جیتا ہو رکتے ہو)۔ یہ مفہوم نیا ہے اور نیو انگلش ڈکشنری بتاتی ہے

کہ اس معنی ہیں کتے" کا لفظ اہلِ انگلستان کی زبانوں پر سترھویں صدی کے شروع میں چڑھا۔۔۔

غالباً یہ امر محتاجِ ثبوت نہیں کہ کبھی انگریز بھی کتوں سے اسی طرح پرہیز کرتے تھے جس طرح ہم لوگ آج تک کرتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر ایک تاریخی شہادت مجھے ایسی دستیاب ہوئی کہ اس کا ذکر یہاں شاید برمحل ہو گا۔ لندن سے بیس میل باہر سولھویں صدی کا بنا ہُوا ایک شاہی محل، جو "ہیٹ فیلڈ ہاؤس" کے نام سے موسوم ہے، اب بھی اپنی پرانی خوبصورتی اور شان کے ساتھ موجود ہے۔ میں اس محل کی سیر کو گیا تو مجھے ایک ایوان کے اندر لکڑی کے زینے کے سامنے دو چوبی کواڑ لگے ہوئے نظر آئے۔ اُن کی حقیقت دریافت کی، جواب ملا کہ پرانے زمانے میں انہیں "کتا پھاٹک" کہتے تھے، اور ان کے لگانے سے غرض یہ تھی کہ جمہوریت کی ترقی سے پہلے انگلستان میں بھی کتے کا شمار جانوروں میں نجس تھا"

فاضل مقالہ نگار نے آخر میں ان اسباب پر بھی بحث کی ہے جنہوں نے کتے کو انگلستان کے جدید معاشرے میں اس قدر ارفع و اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی تصریحات بڑے گہرے غور و فکر کی محتاج ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے اپنے زمانے کے انگلستان میں بعض معاشی حالات نے کتے کی اہمیت کو اور نمایاں کر دیا۔ بن بیاہے پن کی زندگی انگلستان کے مردوں اور عورتوں میں عام ہو گئی ہے اور اس سے انسان کی تنہا ماندگی کے احساس میں شدید اضافہ ہُوا۔ میں نے ٹائمز آف لندن میں ایک دفعہ یہ خبر دیکھی کہ ایک بڑھیا نے وصیت کی کہ موت پر میری لاش جلائی جائے اور میری راکھ میرے کتے کی قبر میں دفن کی جائے۔ ایک اور بوڑھی عورت کا کتا ٹیمز پانی میں ڈوب رہا تھا، عورت نے اسے بچانے کے لیے چھلانگ لگائی اور اپنی جان دے دی۔ بے اولاد اشخاص سے قطع نظر، انگلستان کے لوگ بالعموم کم اولاد ہیں۔ میرے پہلے لینڈ لارڈ مسٹر ہولٹ کا کوئی بچہ نہ تھا اور میری دو لینڈ لیڈیوں میں سے ہر ایک کی صرف ایک ایک

بیٹی تھی۔ خواص کا بھی اس معاملے میں یہی حال نظر آیا مسٹر ہنری مارٹن، پروفیسر آربری، پروفیسر جونز، سب کی صرف ایک ایک صاحبزادی تھی اور کوئی ہائی سکول میں کوئی یونیورسٹی میں تھی، ظاہر ہے کہ ایسے گھروں میں ایک کتے کی موجودگی فی نفسہٖ ضروری ہے۔ انگلستان میں جو دوست میں نے بنائے اُن میں مسٹر اور مسز آرنلڈ بھی تھے۔ دونوں میاں بیوی نہایت شریف النفس، زندہ دل اور علم دوست تھے۔ ان کا کوئی بچہ نہ تھا مگر خدا نے ایک کتا دیا تھا جس سے گھر بھر میں ایک چہل پہل کا عالم رہتا تھا۔ مجھے ایک مرتبہ ٹریفالگر سکوئر (لندن) میں کرسمس کے زمانے کا ایک ہجوم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں گھر گرہست لوگ بھی تھے۔ ایک کنبہ نظر آیا جس کے چار سال کے لڑکے نے ماں کی انگلی پکڑ رکھی تھی اور باپ نے دو ڈھائی سال کے بچے کو کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ معاً میرے دل میں خیال آیا: "انہیں کتا پلنے کی ضرورت شاید پیش نہیں آئی! مجھے یقین ہے کہ اگر حالات کا رُخ وہی رہا جو گزشتہ تین صدیوں سے رہا ہے تو مستقبل کا انگلستانی "محمد حسین آزاد" "انگریزی کی پہلی کتاب" ان لفظوں سے شروع کرے گا:

"ماں کتے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ ریڈیو سن رہا ہے اور کتا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے ....."

اقتباسات ذرا طویل ہو گئے ہیں لیکن فاضل پروفیسر صاحب نے جس خوبی اور دیدہ وری سے اہلِ انگلستان کی کتے کے ساتھ محبت اور اس کے وجوہ پر بحث کی ہے اُس کو دیکھنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ شفقت مادری اور پدری انسان کی کتنی فطری امنگ ہے اور اگر اسے پورا کرنے کا سامان موجود نہ ہو تو وہ اپنے اظہار کے لیے کس قسم کے غیر فطری طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

پھر اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مندرجۂ بالا تصریحات کسی رجعت پسند اور ان پڑھ مُلّا کے احساسات نہیں بلکہ ایک ایسے فاضل شخص کے تاثرات ہیں جس کی انگریزی تہذیب اور ادب پر نہایت گہری نظر ہے۔

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

محسنِ انسانیت ؐ

اور اُجالا پھیلتا ہی چلا گیا

از جناب نعیم صدیقی صاحب

جہاد کا اثر رائے عام پر جیسا کہ ہم پہلے پورے زور سے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ تحریکِ اسلامی اور جاہلیت کے درمیان اصل معرکہ رائے عام کے وسیع میدان میں ہوا، مسلسل اٹھارہ برس جاری رہا اور اسی وسیع میدان میں آخری فیصلہ بھی ہوا۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مسلم جماعت کے معرکہ ہائے جہاد کا سرے سے اس فیصلے کے ہونے میں کوئی دخل ہی نہ تھا۔

اصلاح و تعمیر کے کام میں قوت بجائے خود ایک اہم ضرورت ہے لیکن اجتماعی دائرے میں کوئی انقلاب آج تک بجز اس صورت کے نہیں آیا کہ اس کے علمبردار اپنے آپ کو مضبوط اور غالب و برتر ثابت کر دیں اور راستے کی رکاوٹوں کو ہٹانے اور شر پسندانہ مزاحمتوں کو ختم کرنے کے لیے بوقتِ ضرورت قوت کا استعمال کامیابی سے کر دکھائیں۔ مجرد مذہب جسے انسانی زندگی کے صرف ایک چھوٹے سے خانے سے واسطہ ہوتا ہے اسے لے کے چلیے تو وعظ اور فیضانِ نظر سے بڑھ کر کسی سرگرمی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اوپر کوئی سا نظام اپنا سایہ پھیلائے ہوئے ہو اور معیشت و معاشرت کے معاملات کسی بھی نہج پر چل رہے ہوں، لوگوں کے ذہنوں میں کچھ بھلے عقائد کی جگہ بھی نکالی جا سکتی ہے، ان کو کچھ جاپ اور منتر اور وظیفے سکھائے جا سکتے ہیں، اور ان کو مسکینی و تواضع اور رحم دلی و ہمدردی جیسی خوبیوں سے بھی کسی نہ کسی حد تک آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک فاسد اور ظالمانہ نظام میں اپنی خدمات کھپاتے ہوئے اور اس کے بنائے ہوئے نہایت ہی انسانیت کش راستوں سے رزق اور مفادات حاصل کرتے ہوئے ضمیر میں جو گداز

پڑتے رہتے ہیں، صوفیانہ طرز کے انفرادی مذہب اور ان کے بنائے ہوئے پیری مریدی کے ادارے ان کو ساتھ کے ساتھ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتے رہتے ہیں اور ان پر مرہم لگے پھاہے رکھتے ہیں۔ بدترین تمدن کے اندر چھوٹا سا گوشۂ عافیت نکال لینے والے مذاہب بھی درحقیقت انسان کے ذوقِ فراریت کی تخلیق ہیں۔ وہ اجتماعیت کے دائرے میں بڑے بڑے جرائم کرنے اور خوفناک مظالم میں حصہ لینے کے بعد انفرادیت کی کٹیا میں بیٹھ کر اپنے خدا کو راضی کرتا اور اپنے روٹھے ہوئے ضمیر کو مناتا ہے۔ لیکن جو دین غیر الٰہی نظامِ زندگی کے گاڑھے میں یادِ خدا کے مخمل کا ذرا سا پیوند لگا کر مطمئن نہ ہوتا ہو بلکہ جسے پوری زندگی کو اپنے ہی رنگ میں رنگنا ہو اس کا کام نرے لجاجت آمیز وعظوں، خلوت پسندانہ ریاضتوں اور خدمتِ خلق کے محدود جذبوں سے نہیں چل سکتا۔ اسے باطل کے قفس کو توڑنے، ظلم کے دستِ پا کو باندھ دینے اور امن و انصاف کے دورِ تمدن کی طرح ڈالنے کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اجتماعی تبدیلیاں بغیر مزاحمتوں کے نہیں واقع ہو جاتیں اور مزاحمتیں توڑنے کے لیے نرے وعظ کافی نہیں ہوتے۔ جن کے بچے جمائے سلسلہ ہائے مفادات کو اکھیڑا جاتا ہے اور جن کے حق میں کام کرنے والی ترتیبِ معاشرہ کو بدلا جاتا ہے وہ اپنا سارا زور تخریبی اقدامات میں کھپا دیتے ہیں۔ کوئی تحریک ان کو جب تک زورِ بازو سے کام لے کر راستہ سے نہ ہٹائے، اجتماعی اصلاح کے خوش آئند خوابوں کی تعبیر کبھی برآمد نہیں ہو سکتی۔

اسلام جب اٹھا اور اس نے عین اس اساسی تصورِ حیات پر ضرب لگائی جس پر عرب کا جاہلی معاشرہ چل رہا تھا اور نیم مشرکانہ، نیم مادہ پرستانہ ذہنیت کو لا الٰہ الا اللہ کی زد پر لیا تو بالکل ابتدا ہی میں جاہلی نظام کے علمبردار سمجھ گئے کہ یہ تو ایک شاہ ضرب ہے جو پوری عمارت کو توڑ کر نئی تعمیر کے لیے لگائی گئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بھرپور مخالفت و مزاحمت کی گئی۔ اساسی انقلاب اور ہمہ گیر تبدیلی کی ایسی دعوت جب بھی کبھی رونما ہوتی ہے تو معاشرہ بالعموم تین بڑے بڑے عناصر میں منقسم ہو جاتا ہے۔ وقت سے آگے ہو کر چلنے والے اور دو

تک کے مستقبل کو دیکھنے والے ذہین ترین اور فعال ترین لوگ جن کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے انقلابی دعوت پر آہستہ آہستہ لبیک کہتے ہیں۔ ان کے بالمقابل پرانے نظام میں رہنمائی کرنے والے اور بڑے بڑے مفاد رکھنے والے عناصر متحرک ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے زیرِ اثر طبقوں میں سے بہت بڑی تعداد اپنے حامیوں کی نکال لیتے ہیں۔ ان دونوں قوتوں کے درمیان جن میں سے اول الذکر نشو ونما پانی ہوئی اقلیت ہوتی ہے اور موخر الذکر سکڑتی اور پارہ پارہ ہونی ہوئی اکثریت ہوتی ہے، لمبی کشمکش ہوتی ہے۔ یہ دونوں فعال قوتیں تو فکری اور سیاسی اکھاڑے میں آ جاتی ہیں اور عوام کا انبوہِ کثیر باہر تماشائی بن کر یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کب پلڑا کدھر جھکتا ہے اور اس کھیل کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس تیسرے عنصر میں جتنے بھی ذہین اور متحرک کردار موجود ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ میدانِ کارزار میں اترتے جاتے ہیں۔ لیکن بہت بھاری اکثریت آخری نتیجہ کا انتظار کرتی ہے۔ ان میں بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو پرانے نظام کے اندھے پرستار ہوتے ہیں اور یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کبھی ٹوٹ سکتا ہے اور جب تک وہ انہیں ٹوٹتا دکھائی نہ دے ان کے اندر ذہنی تبدیلی آ ہی نہیں سکتی۔ ان میں سے بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ نئی قوت کے دلائل سے بھی اور اس کے اخلاقی اوصاف سے بھی متاثر ہوتے جاتے ہیں اور بعض تمنا کرنے لگتے ہیں کہ کاشکہ یہ قوت غالب ہو جائے، مگر وہ پرانی طاقت سے اتنے مرعوب ہوتے ہیں کہ ان کو یقین نہیں آتا کہ کبھی اس سے نجات بھی ہو سکتی ہے۔ بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو دعوتِ انقلاب سے متاثر ہو کر قدم آگے بڑھانا بھی چاہتے ہیں لیکن سابق قیادت نے ان کو اس بری طرح اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہوتا ہے کہ وہ ہلنے جلنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی حد تک حق و باطل کا معیار ہی اس چیز کو بنا لیتے ہیں کہ دو نظریوں میں غالب و برتر کو نسا رہتا ہے۔ خصوصیت سے جب دعوت اسلامی ہو تو یہ طرزِ فکر عوام میں زیادہ بڑے پیمانے پر پھیلتا ہے۔ عوام کی یہ وہ ذہنی و نفسیاتی کیفیات ہوتی ہیں جو کسی تعمیری و اصلاحی پیغام کی قبولیت میں رکاوٹ بنتی ہیں اور کشمکش کے مدوجزر سے

ان کیفیات میں جیسی جیسی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، دعوت کو انہی کے مطابق اپنے فروغ میں سہولت یا دقت پیش آتی ہے پس کسی بھی نئی دعوت کے علمبرداروں کے لیے راستہ جبھی کھل سکتا ہے جب کہ وہ کشمکش میں اتنی ثابت قدمی دکھائیں اور مزاحم قوت پر اتنے کاری وار کریں کہ عوام ایک طرف یہ محسوس کرنے لگیں کہ پرانی قیادت کو بدلنا اور پرانے نظام کو توڑنا کوئی ناممکن عمل نہیں ہے اور دوسری طرف وہ نئی قوت سے امیدیں وابستہ کریں کہ اس کے بازوؤں میں اتنا بل بوتا ہے کہ یہ ظلم اور جاہلیت کے علمبرداروں کو اچھی طرح جھنجھوڑ سکے۔ بس جب بھی رائے عام کی فضا میں ایسا تاثر چھا جاتا ہے ایک اصلاحی و تعمیری دعوت کے لیے دلوں کے دروازے پوری طرح کھل جاتے ہیں۔

مدینہ کی اسلامی حکومت نے قریش اور یہود کے جنگی چیلنج کا جواب جس جرأت اور شجاعت سے دیا اور بھرپور طریق سے دیا اس کا مقصود یہ نہیں تھا کہ تلوار کے زور سے کچھ لوگوں کو میدانِ جنگ میں اسلام کا قائل کر لیا جائے، بلکہ جنگ جُو یانہ مزاحمتوں سے اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ ضرور تھا کہ عامّۃ الناس کے حوصلے بڑھیں، ان کی امیدیں مدینہ کی انقلابی قوت سے وابستہ ہوں، وہ نظریۂ اسلامی سے ایک روشن مستقبل کے ظہور کی توقع کریں اور جاہلی نظام کے ٹوٹ جانے کا امکان کم سے کم ان پر واضح ہو جائے۔

چنانچہ بدر کا اوّلیں معرکہ ہوا تو ہر چہار جانب سے نگاہیں زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر لگی تھیں کہ دیکھیں پہلے تصادم میں کون کس کو پچھاڑتا ہے۔ اب جب یہ منظر عوام کے سامنے آیا ہو گا کہ مٹھی بھر مسلم سپاہی جن کے پاس ضرورت کا سامان کم سے کم حد تک بھی مکمل نہ تھا انہوں نے اپنے سے تین گنا تعداد کے لشکر جرار کو بُری طرح زک دے دی ہے اور مکہ کے نامی گرامی سرداروں کا بہ مع ابو جہل کے صفایا کر دیا ہے تو کیا سارے عرب میں اس محیر العقول واقعہ کی دھوم نہ مچ گئی ہو گی، اس کے چرچے اور تذکرے گھر گھر نہ ہوئے ہوں گے اور اس نے رائے عام پر گہرا اثر نہ ڈالا ہو گا۔ اس واقعہ سے پہلی بار عرب میں یہ امید پیدا ہوئی ہو گی کہ مدینہ کی اسلامی طاقت محض کچھ ایسے اللہ والوں پر مشتمل نہیں ہے جو ساری عمر مار کھا کھا کر خدا کی رضا اور روح کی شانتی

حاصل کرنے کے لیے ہتھکنڈے بن گئے ہوں۔ بلکہ اس طاقت کے ہاتھوں ایک نہ ایک دن کایا پلٹ جانے والی ہے۔

پھر اُحد میں معاملہ برابر سرا رہا تو اثرات بھی بین بین قسم کے رہے ہوں گے۔ اس کے بعد خندق کا معرکہ پیش آیا تو عرب نے دیکھا کہ چاروں طرف سے لشکر کے لشکر ایک تباہ کن طوفان کی مانند اُمڈ کر آئے اور مہینہ بھر مدینہ کا محاصرہ کرنے کے بعد جھٹ چھٹ گئے، جیسے مٹھی بھر جو سے کوئی پھونک مار کر اڑا دے۔ اس واقعہ سے یہ اثر بہر حال پھیلا ہوگا کہ مسلم طاقت کی جڑیں اب اتنی مضبوط ہیں کہ مخالفین کی متحدہ قوت بھی ان کو ہلا نہیں سکی۔

ان بڑے معرکوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی قبائلی قیادتوں کی طرف بھی مدینہ نے پوری توجہ رکھی۔ یہ مقامی قیادتیں چونکہ ملک گیر جاہلی نظام قیادت کی لمبی زنجیر ہی کی کڑیاں تھیں اور ایک ایک کر کے ان کو توڑے بغیر اس لمبی زنجیر سے عوام کو رہائی دلانا ممکن نہ تھا اس لیے اس کی کچھ کڑیاں تو دعوت کے اثر سے از خود ٹوٹ گئیں، کچھ کو معاہدانہ اور حلیفانہ روابط کے ذریعے زنجیر جاہلیت سے کاٹ لیا گیا اور بقیہ نے جدھر سے بھی مزاحمت کے لیے سر اٹھایا، اسلامی حکومت نے فوراً اُدھر توجہ کی اور وقت کے وقت سرکوبی کر دی۔ باغیوں، چوروں، ڈاکوؤں، جنگ جوؤں، شورش پسندوں کی ایسی متواتر اور بروقت خبر لی گئی جیسی کہ ملاء اعلیٰ کی طرف شیاطین کے رُخ کرنے پر شہابوں سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ مدینہ کے آس پاس لا اینڈ آرڈر پوری طرح جما دیا گیا اور پُر امن ماحول پیدا کر دیا گیا۔ ورنہ اگر چو طرفہ بکھرے ہوئے اعرابی قبائل کو ذرا بھی ڈھیل ملتی تو مدینہ کی پہلی منظم حکومت کا تجربہ ابتدا ہی میں ناکام ہو گیا ہوتا۔ تاریخی ریکارڈ دیکھیے تو ہجرت کے پہلے سال سے لے کر فتح مکہ تک کا دور شتر بے مہار بغاوتوں، شورشوں اور اجتماعی تصادمات سے بھرا پڑا ہے۔ کل اِدھر جنگی اجتماع ہو رہا تھا، آج وہاں ڈاکوؤں کی ٹولیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک دن اُس جانب کسی جتھے نے غارت ڈالی۔ دوسرے دن اِس جانب کسی دستے نے مدینہ کے شہریوں کو گھائل کر دیا۔ کوئی جنگی سازش اُدھر ہو رہی ہے کوئی باغیانہ منصوبہ اِدھر بن رہا ہے۔

مگر مدینہ خوب چوکس تھا۔ کہیں طلایہ گردی کی ٹولیاں نکل رہی ہیں، کہیں فوجی مہم کی ترسیل کی جارہی ہے اور کہیں پولیس کارروائی کے لیے کوئی ٹیم روانہ ہو رہی ہے۔

ان سارے حالات نے عرب پر بہرحال یہ اثر ڈالا ہو گا کہ مسلم طاقت "لب بہ بندو چشم بند و گوش بند" قسم کی طاقت نہیں ہے، وہ ایک زندہ، بیدار اور فعال حکومت ہے جو چوکھی لڑکر مخالف قبائل کے بے شمار محاذوں سے نمٹ رہی ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ بازی لے جائیگی۔

پھر جب مدینہ میں یہودی اثر کا خاتمہ کر دیا گیا ہو گا اور اس کے بعد موزوں وقت آتے ہی خیبر کا مخالف محاذ توڑ دیا گیا ہو گا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رائے عام کی فضا قبولِ دعوت کے لیے ان واقعات سے کس طرح سازگار ہوتی گئی ہو گی۔

اور فتح مکہ کے زلزلہ انگن واقعہ نے عرب کو اس سرے سے اُس سرے تک جھنجھوڑ کر جاہلیت کی نیند سے جگا دیا ہو گا اور تحریک اسلامی نے نئے دور کی اذان پکار کر پیغام دیا ہو گا کہ اٹھو اجالا ہو گیا؟! اب ہر اندھے نے بھی دیکھ لیا ہو گا کہ جاہلیت، مٹنے والی تھی اور مٹ گئی۔ اب انتہائی قدامت پسند اور مقلد اور مرعوب ذہن کے نچلے طبقوں کو بھی یقین آگیا ہو گا کہ قریش کی فرسودہ قیادت کا دور ختم ہو گیا۔ اب ہر بلید ترین بدو نے بھی سمجھ لیا ہو گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام علم، کردار، زندگی، حرکت، ترقی، تعمیر، نظم، امن، انصاف اور اخوت سے آراستہ کرنے والا پیغام ہے۔ اور عوامی ذہن نے اپنے کواڑوں کی کنڈیاں کھول دی ہونگی اور اپنے روزنوں سے پردے اٹھا دیئے ہونگے تاکہ اسلامی تحریک کی شعاعیں اندر آسکیں۔

پھر ان جنگی کارروائیوں کے اندر خود اسلام کی دعوت کام کر رہی ہوتی تھی۔ یہ لڑائیاں محض تلواروں اور تیروں کی لڑائیاں نہ تھیں، یہ عقیدوں اور نظریوں اور کرداروں کی لڑائیاں بھی تھیں۔ ان لڑائیوں میں مسلم طاقت تکبیر کا نیا نعرہ لے کے آئی تھی۔ وہ میدانِ جنگ میں بھی ذوقِ رکوع و سجود اپنے ساتھ لائی تھی، وہ دشمن کے خلاف اگرپورے جوشِ قوت سے حملہ آور ہوتی تھی تو دوسری طرف دشمن کے سامنے وہ اپنے خدا کے حضور عاجزی سے سر جھکے رکھتی تھی۔ پھر اس کا نئی طرز کا ڈسپلن تھا

اور اس کے قواعد تھے اور اس کے مخصوص اطوار تھے، پھر وہ شہادت اور جنت اور رضائے الٰہی اور حیاتِ ابدی کے تصورات لے کے آئی تھی جن کی مستی میں اس کے سپاہی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھتے تھے اور ہنستے مسکراتے اپنی متاعِ حیات اپنے نصب العین کے قدموں میں نچھاور کر دیتے تھے۔ پھر ان کا ایک درخشاں جنگی اخلاق تھا۔ دوسرے لوگ موسیقی کی تانوں پر حرکت کرتے تھے اور اسلامی تحریک کے جانباز فقط نغمۂ توحید کی تانوں سے تحریک لیتے تھے۔ دوسرے لوگ شرابیں پی پی کر شجاعت کا مظاہرہ کرتے اور اسلام کے سپاہی فقط احساسِ فرض کی مقدس صہبا سے سرشار ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ مالِ غنیمت کی ہوس لے کر جوہر دکھلاتے تھے اور محسنِ انسانیتؐ کے پیرو صرف رضائے الٰہی کی طلب میں خاک و خون میں لوٹ جاتے تھے۔ دوسرے لوگ قوم قبیلے اور نسل کی عصبیت میں بہک کر حملہ آور ہوتے تھے، مگر اللہ کے مجاہد صرف دین اور حق اور سچائی کی حمایت میں معرکہ آرا ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ قتال کے دوران میں نہایت درجہ کی وحشیانہ کارروائیاں کرتے تھے، مثلاً مخالفین کو آگ میں جلانا یا باندھ کر مارنا، ان کے مقتولوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرنا، ان کی کھوپڑیوں میں شرابیں پینا، کلیجہ چبا جانا، عورتوں اور بچوں کو ذبح کرنا، حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ دینا، لیکن مسلم طاقت ایسی انوکھی فوج تیار کر کے میدان میں لائی جو قتال میں بھی انسانیت کی اخلاقی حدوں کا احترام کرنے والی تھی، جس نے نہ کبھی کسی کو وحشیانہ طریق سے قتل کیا، نہ لاشوں کی بے حرمتی کی، نہ عورتوں اور بچوں پر اپنی تیغِ شجاعت کو آزمایا، بلکہ اس پہلو سے اخلاق باختہ مخالفین کی چیرہ دستیوں پر صبر کر کے اپنی طرف سے بہترین نمونہ پیش کیا۔ دوسرے لوگ قیدیوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتے تھے، مگر مسلم طاقت نے ان کو اپنے شہریوں کے ساتھ بھائی بھائی بنا کے رکھا۔ دوسرے قول و قرار کر کے پھر جاتے تھے مگر مسلم طاقت نے نازک ترین مواقع پر نقصان اٹھا کر بھی اپنے ہر عہد کو نبھایا اور اگر ذمہ اٹھایا تو اس کا حق ادا کیا۔ دوسرے مفتوح شہروں میں گھس کر سول آبادی کو ظلم کا نشانہ بناتے تھے مگر مسلم طاقت نے اپنی سپاہ کو ہمیشہ کے لیے اس بات سے روک دیا کہ گھروں میں گھس کر کسی شہری کو نہ مارا جائے اور نہ کسی کے ذاتی سامان کو قبضہ

میں لیا جائے۔ بلکہ دشمن کی سول آبادی سے جبراً رسد تک حاصل کرنا حرام کر دیا گیا۔ دوسروں کے لیے لڑائی ایک دنیوی کارروائی تھی، لیکن مسلم جماعت نے اسے انتہائی بلند عبادت قرار دیا۔

پھر محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عین میدانِ جنگ میں بھی دشمن کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی جاتی تھی تین راستے مخالف کے لیے کھلے ہوتے: اولاً اسلام میں آؤ اور بھائی بھائی بن جاؤ، ثانیاً سیاسی اطاعت قبول کر لو، ثالثاً میدانِ جنگ میں مقابلہ کر لو۔ حالانکہ دوسروں کے ہاں ایسی کوئی اصولی دعوت نہ ہوتی، ان کی طرف سے دو ہی راستے کھلے ہوتے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو یا میدانِ جنگ میں آؤ۔

دو قوتوں کا یہ عظیم الشان فرق میدانِ جنگ کے اسکرین پر کتنا نمایاں ہو جاتا ہو گا اور اس فرق سے آگاہ ہو کر سارا عالمِ عرب متاثر ہوتا ہو گا۔ یعنی مدینہ کی اسلامی قوت کا ایک طرف تیزی سے نشو و نما پانا اور دوسری طرف اپنے کردار سے اپنے نظریہ کی صداقت اور بالاتری کو ثابت کرنا یہ دو گونہ اثرات تھے جو جنگی کارروائیوں کے ذریعے عرب کی رائے عام پر برابر پڑتے رہے۔ ان اثرات نے جوں جوں دعوتِ حق کے لیے راستہ صاف کیا، لوگ اسلام سے وابستہ ہوتے گئے۔ یہ اثرات صلح حدیبیہ کے بعد خاصے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس لیے اس دور میں عوام تیزی سے اسلام کی طرف بڑھے۔ پھر فتح مکہ کے بعد یہ اثرات پوری طرح غالب ہو گئے، اس لیے پورے کا پورا عرب بیک دم اسلامی تحریک کے سایۂ رحمت میں آ گیا۔ ان دونوں ادوار میں عوام نے جس تیزی سے اپنے آپ کو اسلام کے حوالے کیا ہے اسے دیکھ کر یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ قریش کی قیادت عوام کے راستے میں کتنی بڑی رکاوٹ تھی اور اس رکاوٹ کے ہٹتے ہی ذہنی انقلاب رونما ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی کوئی غالب طبقہ اس طرح سے رکاوٹ بنا موجود رہتا ہے وہاں عوام میں وعظ و نصیحت کا اثر کسی بڑے پیمانے پر کبھی رونما نہیں ہو سکتا۔ اجتماعی فضا کو بدلنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ایسی رکاوٹ کو ہٹایا جائے اور اس کے لیے پوری پوری سیاسی جد و جہد کی جائے۔ اسلامی دعوت کی تکمیل سیاسی جد و جہد کی تکمیل ہی پر منحصر ہوتی ہے۔

حکومت خود معلّم انقلاب تھی | پھر جو علاقے متعلقہ قبائل کے اسلام لائے، معاہدانہ تعلقات قائم کرنے یا سیاسی اطاعت قبول کرنے سے مدینہ کی اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آتے تھے ان کو یونہی چھوڑ نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ جس حال میں پڑے ہوں پڑے رہیں اور جو بھی خیالات و کردار ان میں رائج ہوں، ہوتے رہیں۔ بلکہ ان تک دعوت پہنچانے اور ان کی تعلیم و تربیت کرنے کے لیے مؤثر انتظامات کیے جاتے۔ معاملہ صرف اتنا نہ تھا کہ بس قوت کی لاٹھی گھما کر کسی علاقے کو زیرِ نگیں کیا اور پھر انسانوں کو اندر سے تبدیل کیے بغیر بکریوں کے ریوڑ کی طرف ہانکتے پھرے۔ ہر چیز تلوار کی نوک سے منوائی جاتی اور ہر تبدیلی ڈنڈے کے زور سے شروع کی جاتی۔ یہ جبّاری چار دن چل سکتی تھی لیکن دل بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور پھر عوام کی بیزاری کا لاوہ پھٹتا تو سارا کیا کرایا ہوا ہو جاتا۔ قوت کے استعمال کا جز تحریکِ اسلامی کے کام میں دوسرے ہر نظام کے مقابلے میں انتہائی قلیل تھا اور دعوت اور تعلیم و تربیت کا عنصر بہت ہی غالب تھا۔

اصولی نظریوں پر قائم ہونے والی حکومتیں اپنے اندر تبلیغی روح رکھتی ہیں اور ان کی ساری سرگرمیوں میں مقدم ترین مقصود یہ ہوتا ہے کہ عوام کے دل اس اصول اور اعتقاد کو سمجھیں اور اخلاص سے قبول کریں جس پر نظامِ حیات کی اساس قائم ہے۔ ان کے تمام کے تمام محکموں کو اپنے مخصوص کاموں کے ساتھ ساتھ اس مرکزی غرض کو بھی انجام دینا ہوتا ہے۔ ایسی حکومتیں ہر اس مفید ترین چیز کو مسترد کر دیں گی جو ان کے اساسی نظریہ کو نقصان پہنچائے اور ہر اس نقصان دہ صورت کو بھی اختیار کر لیں گی جو لوگوں کے ذہنوں میں بنیادی اصول کو راسخ کرے۔ ان کے سامنے تمام مصلحتوں میں سے اہم ترین مصلحت یہی ہوتی ہے کہ شہری نئے نظام کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں اور ہم آہنگ رہیں اور اس کے دستِ بازو بن کر اپنے اندرونی جذبے سے کرنے کے کام کریں اور مٹانے کی چیزوں کو مٹائیں۔

چنانچہ مدینہ کی اسلامی حکومت نے ایک طرف تو یہ اہتمام کیا کہ سخت ترین جنگی حالات میں بھی مختلف علاقوں میں دعوتی اور تبلیغی وفود روانہ کیے۔ کم از کم چار مواقع ایسے ہیں کہ جن میں مدینہ سے جانے والے داعیانِ حق کو شر پسند عناصر نے شہید کر دیا۔ دعوت کی راہ میں انتہائی مظلومی سے شہید ہونے والوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خندق کے جملہ مسلم شہداء سے زیادہ تھی۔ بہرحال انتہائی

نازک اور مشکل حالات میں بھی اس بنیادی فریضہ سے غفلت نہیں برتی گئی بلکہ قربانیاں دے کر اسے جاری رکھا گیا۔ پھر بعض اصحاب کو مدینہ میں کچھ تربیت دے کر انہی کے قبائل میں داعی کے طور پر مامور کر دیا گیا۔ ایسے چند نام ہمارے سامنے ہیں :۔ (۱) طفیل بن عمرو دوسی (قبیلۂ دوس)، ۲۔ عروہ بن مسعود (ثقیف)، ۳۔ عامر بن شہر (ہمدان)، ۴۔ ضمام بن ثعلبہ (بنو سعد) ۵۔ منقذ بن حیان (بحرین)، ۶۔ ثمامہ بن اثال (نجد)۔ علاوہ ازیں بعض قبائل یا افراد کی طرف خصوصی اصحابِ دعوت کو مامور کر کے روانہ کیا گیا جیسے حضرت علی کو ہمدان، جذیمہ اور مذحج کی طرف، مغیرہ بن شعبہ کو نجران کی طرف، وبر بن نخیس کو ابنائے فارس (فارس کے رؤسا جو یمن میں مقیم ہوئے) کی طرف، خالد بن ولید کو علاقۂ مکہ کی طرف، عمرو بن عاص کو عمان کی طرف اور مہاجر بن ابی امیہ کو حارث بن کلال شہزادۂ یمن کی طرف روانہ کیا گیا۔

لیکن اس سے بہت بڑے پیمانے پر اسلامی حکومت نے اپنے سول حکام سے اسلام کی اشاعت اور تحریکِ اسلامی کے فروغ کی خدمت لی۔ اسلامی حکومت کے افسر کچھ نوکری پیشہ لوگ نہ تھے اور نہ وہ روٹی کمانے کے خیال سے بھرتی ہوتے تھے۔ وہاں تو مقصود صرف کلمۃ اللہ کو سربلند کرنا اور انسانوں کو بھلائی کے راستے پر ڈالنا تھا۔ یہ کام تنخواہ کے پجاریوں کے کرنے ہی کا نہ تھا۔ یہ تو صرف اس نورانی انقلاب کے بے لوث خادموں ہی کی دلچسپی کی چیز ہو سکتی تھی اور انہی کے ہاتھوں یہ ہو بھی سکتا تھا۔ وہ لوگ نہ خود کسی عہدے کا لالچ رکھتے تھے اور گریڈوں اور ترقیوں کے چکر میں پڑتے تھے۔ ان کو تو عہدے خود پکارتے تھے اور فرائض خود چن چن کر بلاتے تھے اور گزر بسر کے معاوضے پر ان سے انتہائی اونچی خدمات لی جاتی تھیں۔ یہاں ایک ہی مثال کافی ہو گی کہ حضرت عتاب بن اسید کو مکہ کا گورنر مقرر کیا گیا تو ایک درہم یومیہ تنخواہ مقرر کی۔ اس گورنر نے تقریر میں خود کہا کہ "خدا اس شخص کو بھوکا رکھے جو ایک درہم روزانہ پا کر بھی بھوکا رہا" (ابن ہشام)۔ یہ لوگ اپنے عقیدے اور اپنے محبوب نظام کے داعی پہلے تھے اور کچھ اور اس کے بعد تھے۔ پس مدینہ کی حکومت جن لوگوں کو بھی کسی جگہ گورنر، جج، تحصیلدار اور مال افسر مقرر کرتی تھی، وہ اپنے اپنے حدودِ عمل میں توحید کے داعی، اسلام کے معلّم اور اخلاقِ عامّہ کے معمار بھی ہوتے تھے۔ ان حضرات کو جب ان کے فرائض سے آگاہ کیا جاتا تھا تو اسی وقت حضورؐ اس اساسی غرض پر بھی ان کو متوجہ فرماتے

مثلاً حضرت معاذ بن جبل کو جنہیں یمن میں مالی، انتظامی اور عدالتی فرائض سونپ کر افسر مقرر کیا تو ان کو یہ تلقین بھی فرمائی کہ "لوگوں کو قرآن کی تعلیم دو اور انہیں اسلام کے احکام سکھاؤ" پھر انہیں اہل کتاب مخاطبین کو ملحوظ رکھ کر تفصیل سے دعوت کا اسلوب سمجھایا کہ پہلے انہیں توحید کی دعوت دینا، اسے مانیں تو پھر نماز کے لیے کہنا اور اس کے بعد زکوٰۃ کے لیے۔ یہی افسر اکثر و بیشتر اپنے ہیڈکوارٹر میں امام صلوٰۃ بھی ہوتے تھے۔ البتہ بڑی آبادیوں میں جہاں تقسیم فرائض ناگزیر ہوتی وہاں انتظامی افسروں کے ساتھ مستقل ائمہ صلوٰۃ کا تقرر بھی کیا جاتا۔ جیسے کہ عتاب بن اسید مکہ میں، عثمان بن ابی العاص طائف میں اور ابو زید انصاری عمان میں مامور ہوئے۔ سول افسروں کی تعداد چونکہ خاصی زیادہ ہے اس لیے ہم یہاں فہرست نہیں دے رہے لیکن اس تعداد کو دیکھا جائے اور اس کے علاقہ ہائے تقرر کو دیکھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اسلامی حکومت کی سول سروس نے اسلام کی روشنی کو پھیلانے میں کتنا بڑا کام کیا ہوگا۔ پھر یہ داعیانِ حق اپنی افسری میں اس عام تصور سے بالکل مختلف تھے جو اس وقت پھیلا ہوا ہوگا۔ نہ وہ خدا سے بے خوفی، نہ وہ ٹھاٹھ باٹھ، نہ وہ جور و تعدی، نہ وہ عوام سے دُور دُور رہنا، نہ لوگوں کی ضروریات و حاجات سے غفلت، نہ ہٹو بچو کی صدائیں، نہ دربانوں اور چاؤشوں کا ہنگامہ، نہ محلات و قصور، نہ سلب و نہب، نہ رشوت ستانی، نہ خوشامدیوں کے حلقے، نہ اندھی داد و دہش، نہ شرابوں کے دور، نہ موسیقی کے زیر و بم، نہ رقاصاؤں کے ہجوم —— یہ سول افسر بالکل نئی قسم کے افسر تھے۔ یہ حاکم نئے انداز کے حاکم تھے۔ لوگوں کے لیے ان کی حکومت کا تجربہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ کم تنخواہیں لینے والے، سادہ گذر بسر کرنے والے، دیانت داری سے فرائض ادا کرنے والے، رعایا سے رحم و شفقت رکھنے والے، بے لاگ انصاف پر چلنے والے اور پھر اپنے خدا کے سچے پرستار —— یہ نیا حاکمانہ کردار دلوں کو مسحور کرکے قریب لاتا ہوگا۔ اور پھر جب یہ لوگ سچائی کا پیغام دیتے ہونگے تو وہ سیدھا سینوں میں جاگزیں ہو جاتا ہوگا۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو علاقہ زبید و عدن کا حاکم مقرر کیا گیا تو ان کی دعوت سے وہاں کے سارے لوگ بہت جلد مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح جریر بن عبداللہ بجلی کو یمن کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے حمیریوں (ذوالکلاع حمیری) پر افسر مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے اتنا اثر ڈالا کہ وہ لوگ

وجُودِ باری تعالیٰ پر ایک فیصلہ کُن شہادت

انڈریو کانوسے ادی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایم۔ ڈی۔ ڈی۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی (ترجمہ: عبدالحمید صدیقی)

[یہ مضمون "پھیلتی ہوئی کائنات میں وجودِ باری تعالیٰ" کے آخری باب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور مکتبہ افکارِ اسلامی لاہور اسے عنقریب شائع کر رہا ہے]

کیا خدا ہے؟ یقیناً ہے! مجھے اس کے وجود کے بارے میں اتنا ہی محکم یقین ہے جتنا کہ اس کائنات کی دوسری حقیقتوں کا ہے۔ میں جس قدر وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ہوں اور دنیا میں موجود ہوں اس سے کہیں زیادہ وثوق کے ساتھ میں خدا کے وجود کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔

ایمان باللہ ہی سے اس کائنات کے وجود کی صحیح تعبیر و توجیہ کی جا سکتی ہے، اسی کے ذریعہ انسانی ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا ہے کہ انسان اپنی ایک مستقل شخصیت رکھتا ہے اور محض مادہ اور قوت کا پیکر نہیں یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کے اندر اس احساس کی آبیاری کرتا ہے کہ نوعِ بشری کے سارے ارکان فطرت کے اعتبار سے برابر اور ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ اخوت میں مربوط ہیں۔ پھر اُس بلند و بالا ذات پر ایمان ہی ہمیں اپنے حقوق سے آشنا اور اپنے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ ان حقوق اور فرائض کی تہ میں یہ بنیادی تصوّر کارفرما ہے کہ ہم ایک ذات کی نگاہ میں جس کی محبت پاک،

۴۔ اسلامی تحریک میں شامل ہوئے اور اسی خوشی میں انہوں نے ۴ ہزار غلام آزاد کیے۔

گویا حکومت کے سول محکمے اس سرگرمی اور یک جہتی سے متواتر کام کر رہے تھے اور اسی وسیع پیمانے کی تعلیمی مہم کا نتیجہ تھا کہ عرب کی بعید ترین آبادیوں میں صرف سیاسی نہیں، ذہنی اور قلبی انقلاب رونما ہوتا چلا گیا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اخلاقی لحاظ سے کایا پلٹ گئی۔ بالآخر عرب کا اجتماعی انسان بدل کر بالکل نئے روپ میں اُبھرا۔

اور جس کا انصاف بے لاگ ہے، سب یکساں اور برابر ہیں۔ اس نظریۂ حیات کو اپنانے سے ہمارے اندر اس بات کا شعور بیدار ہوتا ہے کہ ذلت و ناکامی، یا فلاح و کامرانی کا واحد سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی مشیت کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا اس لیے قدرتی طور پر یہ عقیدہ انسان کو قوت و طاقت کے ایسے لازوال خزانے عطا کرتا ہے جن کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ یہ عقیدہ ہی وہ محکم اور ٹھوس بنیاد ہے جس پر مستقل اور پائیدار اقدار کا ایک وسیع الشان محل تعمیر ہوتا ہے کیونکہ ازل و ابد کا تصور اسی ذات سے وابستہ ہے۔

تصورات کے وہ اصول جو ہمیں روزمرہ کے تجربات سے حاصل ہوتے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کے ذریعہ خدا کے وجود کو منطقی طور پر ثابت کیا جاسکے۔ اسی قسم کا ایک اصول تھامس کونس نے پیش کیا تھا۔ اس طرزِ استدلال کے اساسی اصول اُن تجربات سے ماخوذ ہیں جن سے بہت سے والدین کو ایک بچے کی ذہنی نشو و نما کرتے ہوئے سابقہ پیش آتا ہے۔ خدا کے وجود کو منطقی طور پر اس محکم طریق سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ اس سے اُن لاتعداد مفکرین کو دولتِ ایمانی اور طمانیت قلبی حاصل ہوئی ہے جن کا سائنس کی ترقی اور انسانی فوز و فلاح میں ایک بہت بڑا حصہ ہے۔

یہ قول کہ خدا موجود ہے اس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا اور یہ دعویٰ کہ خدا نہیں ہے اس کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کارل مارکس اور لینن کی طرح بہت سے ملحدین نے باری تعالیٰ کے وجود کی نفی تو کی ہے لیکن اس کے انکار کے لیے وہ آج تک کوئی عقلی ثبوت فراہم نہیں کرسکے۔ ایک آدمی کو اس بات کا پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کرے لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنے اس اشتباہ کے لیے کوئی ٹھوس عقلی دلائل بھی پیش کرسکے۔ میری نظر سے آج تک نہ تو کوئی ایسی تحریر گزری ہے اور نہ ہی میں نے کبھی کوئی ایسی تقریر سنی ہے جس میں علمی استدلال کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا گیا ہو کہ خدا کا وجود محض افسانہ ہے۔ اس کے برعکس بہت سی ایسی کتابیں میرے زیرِ مطالعہ آئی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خدا موجود ہے۔ پھر میں نے اُن خوشگوار اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جو ایمان باللہ لوگوں کے قلب و دماغ پر مرتب کرتا ہے اور اُن مضر نتائج سے بھی

واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو انکارِ خدا سے پیدا ہوتے ہیں۔

ملحدین باری تعالیٰ کے وجود کے لیے بالعموم جو ثبوت طلب کرتے ہیں اُن کی نوعیت دیکھ کر اس بات کا بآسانی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ حضرات خدا کو ایک انسان، ایک مجسمہ، بُت یا مورتی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اگر خدا ان مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتا یا وہ حسی صفات سے متصف ہوتا تو پھر اس کے وجود کے بارے میں دو رائیں ممکن نہ تھیں۔ خداوند تعالیٰ نے اس کائنات میں انسان کو جو مقام عطا کیا ہے اُس میں چونکہ اُسے اختیار کی نعمت سے بھی مالا مال کیا گیا ہے اور اسے اس بات کی آزادی بخشی گئی ہے کہ اگر چاہے تو خالق کے وجود کا اقرار کرے اور اگر چاہے تو انکار کر دے، اس لیے اس فیصلہ میں بھی وہ جو روش اختیار کرتا ہے وہ بھی خدائی منصوبہ بندی کے ذیل میں آجاتی ہے۔ وہ اس معاملہ میں خود مختار ہے کہ کمزور اور بودی دلیلوں کا سہارا لے کر ذات باری تعالیٰ کے بارے میں ریب و تشکک میں مبتلا ہو اور پھر اُن بُرے نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار ہو جو اس ملحدانہ اندازِ فکر کے بالکل قدرتی اور منطقی تقاضے ہیں۔

بہت سے دہریے اور کچھ عیسائی بھی خدا کو ایک ایسی شخصیت خیال کرتے ہیں جس سے انسان سودا بازی کر سکتا ہے۔ وہ بسا اوقات یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں "میں صرف اسی صورت میں نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرونگا اگر خدا میری روح کو نجات دلائے گا۔ میں خدا پر اُس وقت ایمان لاؤنگا اگر وہ ہمیں بارش سے نوازے گا یا سیلابوں کی روک تھام کرے گا۔ یا میرے کرب و اضطراب کو سکون و اطمینان سے بدل دیگا یا دنیا سے برائی اور ناانصافی، یا جور و جفا کا خاتمہ کرے گا۔ اگر رحیم و کریم خالق الواقع موجود ہوتا تو میرے مسوڑوں میں کیونکر ٹیس اٹھتی۔ اس قسم کے لغو طرزِ استدلال کا مطلب یہ ہوُا کہ میں خدا پر صرف اسی صورت میں ایمان لاسکتا ہوں اگر وہ اس کائنات کو میرے پیش کردہ منصوبہ کے تحت پھر سے تعمیر کرنے پر رضامند ہوجائے اور اس نظام کی تخلیق میں میری عقل ایک فیصلہ کن قوت کی حیثیت سے شریک ہو۔

معرفتِ الٰہی کا سیدھا اور معقول راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کو ہر قسم کی نفسانیت، اور کجی سے پاک کریں اور اپنے راستے سے اُن سارے موانع کو دُور کریں جو صحیح اندازِ فکر کی راہ میں بالعموم حائل ہوتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے ہمارا خدا پر ایمان اور یقین پختہ ہوجاتا ہے اور اس طرح ہم اس

ظلم و تعدی کی اس دنیا سے بیخ کنی کر سکتے جس کا ہم ہر وقت رونا روتے رہتے ہیں۔ ایک شخص کو خوراک کے اثرات پر جس قدر گہرا یقین ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ محکم ایمان خدا کے پرستار اپنے خالق پر رکھتے ہیں۔ خدا ہم پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ ہم ہر وقت برائیوں کا تذکرہ کرنے کی بجائے اُن منکرات کے استیصال کی فکر کریں جو اس دنیا میں ہر سُو پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی عقلی اور فکری صلاحیتیں اس جدوجہد کی نذر کر دیں جس سے خدا کی بادشاہت کا خواب، اس آب و گِل کی دنیا میں شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔

میرے اُس خالق پر ایمان کی بنیاد جس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے، جس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے اور جو مجھ میں اور مجھ جیسے دوسرے انسانوں میں یکساں دلچسپی رکھتا ہے، اعتقاد، امید اور محبت ہے۔ ایمان کی اساس اگر رجائیت اور محبت نہ ہو اور اگر اس کی تائید عقل و خرد سے نہ ہوتی ہو تو ایسا ایمان میرے لیے کبھی بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

انسان کو اپنے ذہنی قویٰ کبھی بھی معطل نہیں کرنے چاہئیں بلکہ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اُن سے صحیح صحیح کام لے۔ وہ ایمان جس کو عقل سہارا نہ دے سکے وہ بہت کمزور ہوتا ہے اور کسی وقت بھی خارجی حملوں سے برباد ہو سکتا ہے۔ ایسے اندھے بہرے اعتقادات سے سیرت و کردار کے اندر بہت سے نقائص رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا انسان کے لیے یہ چیز ازبس ضروری ہے کہ وہ عقل سے کبھی بھی دستبردار نہ ہو اور فکر و عمل کے اُن عام اصولوں سے صرفِ نظر نہ کرے جن سے وہ اپنی روزمرہ زندگی میں کام لیتا ہے یا جن سے بڑے بڑے سائنس دان اپنی تحقیقات و انکشافات میں مدد لیتے ہیں۔ جو اصول مادی ترقی میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں وہی اصول خدا کے معاملے میں ہمیں ایک صحیح نتیجہ تک پہنچا سکتے ہیں۔

وہ اصول جن کے تحت ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ کل صبح سورج طلوع ہو گا، یا کل میں ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لیے جدوجہد کروں گا یا اپنے کاروبار میں گوناگوں مسرت محسوس کروں گا۔ اگر فکری صلاحیتیں مادی فلاح و بہبود کے لیے کامیابی کے ساتھ استعمال کی جا سکتی ہیں تو پھر میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر انہیں روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے کیوں مشعلِ راہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر فرد کو پوری جرأت و بیباکی سے اُس طرزِ استدلال کی نشاندہی کرنی چاہیے جس پر اُس کے دین و ایمان کا دار و مدار ہے اور پھر اعمالِ صالح

کی گواہی سے اپنے اس ایمان کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے۔

اگر تم خدا کے وجود کو دلائل سے ثابت نہیں کر سکتے تو پھر تمہیں اس ذات کو محض ایک عقیدہ کی حیثیت سے ماننا ہوگا۔ اور یہ چیز بھی عقل و فکر کے منافی نہیں بلکہ اُس کے عین مطابق ہے۔ ہم زندگی کی بے شمار چیزوں کو بدیہی حقائق سمجھ کر، بغیر کسی دلیل کے قبول کر لیتے ہیں۔ تھامس جیفرسن نے اعلانِ آزادی میں بعض ایسے حقائق کی طرف ہی اشارہ کیا جب اُس نے کہا:

ہمارے نزدیک یہ چیزیں مسلّمات کی حیثیت رکھتی ہیں کہ سارے انسان انسانیت کے اعتبار سے برابر ہیں اور انہیں اُن کے خالق اور مالک نے بعض مستقل حقوق عطا کیے ہیں۔ انسانوں میں زندگی کی حرارت، آزادی کی تڑپ اور مسرت کی خواہش ہر وقت موجود رہتی ہے۔ انہیں حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے حکومتیں معرضِ وجود میں آتی ہیں"

جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ وہ خدا کو محض عقیدے کے طور پر مانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ کوئی خلافِ عقل بات کر رہا ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ خدا کو ایک ایسی بدیہی حقیقت سمجھتا ہے جس کے لیے وہ کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہ کہنا کہ خدا کا وجود ایک امرِ واقعہ ہے اُس کے عدمِ وجود کی دلیل نہیں ہو سکتا ــــ بلکہ کھینچ تان کر بھی اگر اس کا کوئی مطلب نکالا جا سکتا ہے تو صرف یہ ہے کہ میں اس چیز کو سائنٹفک طور پر ثابت کرنے سے قاصر ہوں یا میں اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی منطقی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ خدا تو موجود ہے لیکن اُس کے وجود کو علمی طور پر منوانے کے لیے اگر میں کوئی دلائل نہیں رکھتا تو یہ میری اپنی کوتاہی ہے اور میری اس کم نظری کو کسی طرح بھی امرِ واقعہ کے غلط ہونے کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ ممکن ہے اس معاملہ میں میرا علم ناقص ہو، یا میں اس کے لیے خاطر خواہ تیاری نہیں کر سکا یا میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے طرزِ استدلال کے لیے یہ موقع موزوں نہیں ہو سکتا۔ میری آج تک کسی ایسے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی جس سے جب اصرار کے ساتھ یہ پوچھا گیا کہ وہ خدا پر کیوں ایمان لایا ہے تو اُس نے اُس کے لیے کوئی دلیل نہ پیش کی ہو۔ اگر ان مختلف افراد کے مختلف دلائل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اختلاف کے باوجود اُن کا مقصد اور مدعا ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس

کائنات کا ایک خالق ضرور ہونا چاہیے اور اس کے نظام کو چلانے کے لیے ایک ناظم اور نگران کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اگر ایک مشین مشین ساز کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی تو یہ کائنات ایک خالق کے بغیر کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جسے ہر بچہ، بوڑھا اور نوجوان نہ صرف اچھی طرح جانتا ہے بلکہ اسے پوری طرح مانتا بھی ہے۔

ایک بچے کا طرزِ استدلال | جب میری عمر بمشکل تین برس کی تھی تو میں نے اس عمر کے عام بچوں کی طرح اپنے والدین سے اس قسم کے سوالات پوچھنے شروع کیے: مجھے، ان پرندوں کو جنھیں میں دیکھ رہا ہوں، ہماری اس گائے کو اور اس کائنات کو کس نے پیدا کیا۔ زندگی کے سیدھے سادے حقائق اور میرے ذاتی تجربات نے میرے ذہن میں اس خیال کو راسخ کر دیا کہ مشین مشین ساز کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ اس مقام پر میرے فکر نے میری دستگیری کی اور میں ان ابتدائی معلومات سے گزر کر کہ میں ہوں، پرندے موجود ہیں اور گائے ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سب چیزوں کے وجود کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہونی چاہیے اور وہ علت اولیٰ خالق اور مالک کی بلند و بالا ذات کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح سے میرے فہم نے جو ہر قسم کی الجھنوں اور پریشانیوں سے پاک اور ذہنی مغالطوں سے ناآشنا تھا اُس نے زندگی کے اُن اسرار و رموز کا ادراک کیا جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

فکر و عمل کے تعامل سے میرے اندر شعورِ ذات پیدا ہوا اور میں نے وجود اور عدمِ وجود کے درمیان تمیز کرنا سیکھا، یا دوسرے لفظوں میں میرے اندر یہ احساس بیدار ہوا کہ میں ہوں، اور پرندہ، گائے یا دنیا نہیں ہوں۔ اس طرح اوائل عمر ہی میں میرے ذہن نے "وجود اور عدم وجود" کے اصولوں سے مجھے آشنا کیا۔ اس کے علاوہ اسی دور میں مجھے جزو اور کُل کے باہمی تعلق کا بھی علم ہوا اور مجھے یہ حقیقت معلوم ہو گئی کہ کل جزو سے ہمیشہ اور ہر حالت میں بڑا ہی ہوتا ہے۔

وجود اور عدمِ وجود کے احساس کے پرورش پانے کے ساتھ ساتھ بچے کے اندر استدلال کی یہ قوت اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اثبات و نفی کو ایک جگہ جمع نہیں کرتا۔ چھوٹے بچے

بھی اپنے اور اپنی بہن کے درمیان پوری طرح تمیز کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں "کہ یہ میں ٹام ہوں اور وہ میری بہن میری ہے۔" اُن کے اندر بھی اتنی عقل ضرور موجود ہوتی ہے کہ سوائے مذاق کے یہ کبھی نہیں کہتے "کہ ہم میری ہیں اور ہماری بہن ٹام ہے۔" پھر ایک بچہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ مربع کو گول کہنا غلط ہے۔ مربع اپنی اس شکل کے لیے کافی وجوہ رکھتا ہے اور یہی وجوہ اس کے مربع ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

بچے کا یہ علم اور یہ حقیقت کہ بچہ اپنے اور پوری کائنات کے خالق کی معرفت حاصل کرنے کا انتہائی آرزومند ہے، اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس نے علت و معلول کے بنیادی اصول کو دریافت کر لیا ہے۔ وہ اس امر سے پوری طرح واقف ہو چکا ہے کہ ہر نتیجہ کا ایک سبب ضرور ہوتا ہے اور کوئی مشین بھی مشین ساز کی حکمت و دانائی کے بغیر تیار نہیں ہو سکتی۔ یہ اندازِ فکر زنجیر کے حلقوں کی طرح مسلسل چلتا ہے اور انسانی ذہن اپنے وجود اور کائنات کے وجود سے قدرتی طور پر اس ذات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس ساری تخلیق کی علتِ اولیٰ ہے جب بھی انسان حرکت کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دماغ میں فوراً محرک کا تصور آ جاتا ہے اسی حقیقت کو ایک دوسرے طریق سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

کائنات پر ایک نگاہ دوڑائیے تو آپ کو اس میں ایک زبردست نظم و ترتیب نظر آئے گی۔ یہ نظم و ترتیب ایک ناظم اور مرتب کے وجود کی زندہ شہادت ہے۔ اتنی وسیع و عریض کائنات کا نظم و نسق کوئی معمولی شخصیت سنبھال نہیں سکتی۔ لہٰذا اس کائنات کی ناظم وہی قادرِ مطلق ذات ہے جس کی قوتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جس کو اختیار کر لینے کے بعد ایک تین چار سال کا بچہ بھی علت و معلول کے ذریعہ خداوند تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے۔

میں نے ایک سائنس دان کی حیثیت سے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اُن اسباب کو معلوم کرنے پر صرف کیا ہے جو حدِ ادراک سے ماوراء حقائق کے پیچھے کارفرما ہیں۔ میرا ذہن کائنات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ نظامِ تکوینی کے پرے اُس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کے لیے

بتیاب رہتا ہے جو ساری روحانی اقدار کا واحد سرچشمہ ہے۔ اپنی اس تحقیق کے دوران میں میں نے علوم طبیعی اور علوم اخلاقی کا اچھا خاصا مطالعہ کیا۔ میں اس چیز سے غافل نہیں ہوں کہ بہت سے نامور مصنفین جن میں مشہور و معروف فلسفی اور مفکرین بھی شامل ہیں، انہوں نے اس میدان میں بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں یا تو انہوں نے معروف حقائق سے مجرمانہ تغافل برتا ہے یا محسوسات سے بلند ہو کر کبھی سوچنا اور غور کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ سائنس دان جو ہمیشہ محسوسات کے خم و پیچ ہی میں اُلجھتے رہتے ہیں وہ دراصل اپنی ترقی کی راہ میں خود ہی موانع پیدا کرتے ہیں۔ ایک صاحبِ فکر تحقیقی کامیابی سے صرف اسی وقت ہمکنار ہوتا ہے جب وہ مادہ کی تنگ و تاریک دنیا سے نکل کر اس ادراک کو اپنا رہنما تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جو اس کائنات میں ایک ہم آہنگی پاتا ہے اور پھر ایمان، محبت اور صداقت کی زادِ راہ لے کر آگے بڑھنے کی فکر کرے۔

قانون علت کافی سالوں کا ذکر ہے کہ بہت سے تاجر کھانے کی میز پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسی دوران میں ایک سائنس دان کا ذکر آگیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ وہ تو پکا ملحد ہے۔ ایک دوسرے تاجر نے اس فقرہ پر گرہ لگائی اور بڑے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر دیا کہ سائنس دانوں کی اکثریت خدا کی منکر ہوتی ہے۔ اپنی اس رائے کے اظہار کے بعد اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے اشاروں اشاروں میں اس بات کا مطالبہ کیا کہ میں اس رائے کے بارے میں اپنے ذاتی احساسات پیش کروں۔ میں نے اس رائے کی پُرزور تردید کی اور کہا کہ یہ سائنس دانوں پر محض اتہام ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سائنس کی دنیا میں جتنے نامور لوگ گزرے ہیں اور جنہوں نے انسانیت کو اپنی تحقیقات سے بہرہ مند کیا اُن کی ایک عظیم اکثریت خداوند تعالیٰ کے وجود کی قائل ہے۔ اُن میں بعض کے خیالات کو یا تو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے یا لوگوں کو انہیں سمجھنے میں غلطی لگی ہے انکارِ خدا تو اس اندازِ فکر کے ہی منافی ہے جس کے مطابق ایک سائنس دان سوچتا اور تحقیقات کے میدان میں

آگے بڑھتا ہے۔ وہ اپنے کام کا آغاز اس بنیادی تصور سے کرتا ہے کہ کوئی مشین بھی مشین ساز کی قوتِ فکر و عمل کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ معلوم و معروف حقائق سے استدلال کرتا ہے اور عزم و یقین کی دولت لیے ہوئے تجربہ گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کی معتد بہ تعداد نئے نئے حقائق کی گرہ کشائی میں جن مصائب اور تکالیف سے دوچار ہوتی ہے اُن کے پیچھے عام طور پر علم کی محبت، نوعِ بشری کی محبت اور خالق کی محبت کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں سائنس دان اپنی زیادہ تر توجہ آلات اور اجسام پر صرف کرتا ہے۔ ایسی چیزیں جو مشاہدہ اور تجربہ کی گرفت میں آسکیں مگر اس کی تحقیق کی بنیاد ان چیزوں پر نہیں بلکہ علت و معلول کے اُس اصول پر ہے جو اس کائنات کے پورے نظام میں جاری و ساری ہے۔ وہ اپنی تحقیق کی پوری عمارت اس بنیادی تصور پر اٹھاتا ہے کہ اس کائنات میں ایک نظم و ترتیب ہے اور اس کے خارجی مظاہر میں حیرت انگیز اختلاف کے باوجود ایک معنوی ربط پایا جاتا ہے۔ علت و معلول کا اصول ہی دراصل اُس کی اساس ہے۔

علم الابدان میں جب ہم جسم کی بقا، اُس کی نشو و نما اور اس کی تخریب و تعمیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر خلیہ بلا استثناء اپنے اُس فرض کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے جو اسے جسم کی مجموعی فلاح کے سلسلے میں سونپا گیا ہے۔ نظامِ اعصاب میں وہ اعمال جو محض اضطراراً سرزد ہوتے ہیں اُن کے پیچھے بھی ایک گہری حکمت اور مقصدیت کام کرتی ہے اور یہ مقصدیت اُن کا ایک بنیادی وصف ہے۔ جب انسان اسی نہج پر مزید غور و خوض کرتا چلا جاتا ہے تو وہ بالکل فطری طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ذہنی نشو و نما کے لیے فطرت نے جو نظام قائم کیا ہے وہ حسی تجربات کے تعامل سے علت و معلول کے رشتہ کو قبول کرنے پر بالکل مجبور ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسی حقیقت کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مشین جو سارے جسم کے مقصدی اعمال کی ذمہ دار ہے وہ ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ حسی تجربات کے ساتھ مل کر اس میں شعور و آگہی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ شعور پھر اُس کے اندر احساسِ قدر یا احساسِ علت پرورش کرتا ہے۔ یہ ہے

وہ طریق جس سے ایک خلیہ کا مقصدی ردِ عمل ارتقائی مراحل سے گزرتا ہوا اپنے اردگرد کی پھیلی ہوئی دنیا کا شعور اور احساس حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد اس میں احساس امتیاز جنم لیتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے اعمال کو علت و معلول کی کڑیوں میں جوڑتا ہے اور پھر وہ اپنے ماحول پر قدرت حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔

علم الابدان کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مچھلی کے گلپھڑے اس بات کی زندہ شہادت ہیں کہ اس جانور کے نزدیک پانی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ پرندے اور انسانی پھیپھڑے ہوا کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ انسان کی آنکھیں روشنی کی اہمیت واضح کرتی ہیں۔ جو انسان بھی علم کے حصول کے لیے کمربستہ ہوتا ہے اس کی نگاہ میں حقائق کا وجود سب پر مقدم ہے۔ اس کرۂ ارضی پر زندگی کا موجود ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ یہاں ایک قانون طبیعی کارفرما ہے جو زندگی کی بقا اور نشو و نما کا ضامن ہے۔ اگر یہ سب چیزیں اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں اور اس کائنات میں علت و معلول کا ایک زبردست رشتہ قائم ہے تو پھر فکری دلیل حیران ہے کہ فہم و فراست، صحیح طرزِ استدلال، ہمت و شجاعت، احساسِ فرض، ایمان اور یقین کیوں کسی بلند و بالا ذات کے وجود کی شہادت نہیں دیتے۔ میرے نزدیک اس سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ عمیق اور گہرے خیالات، مقدس احساسات و جذبات اور نیک اور صالح افعال کسی برتر ذات کے وجود کے گواہ نہیں ہیں۔ یہ سب کیفیات، یہ سارے افکار و اعمال اس سب سے ارفع و اعلیٰ ذات، اس خالق و مالک کے وجود کی گواہی دیتے ہیں جسے اس ہنگامۂ حیات میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جو اس کی معرفت حاصل کرنے کا آرزومند ہے اور جو اس راہ میں خود غیر فطری موانع پیدا نہیں کرتا۔ قانونِ علت کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ساری کائنات اسی کے دم قدم سے قائم ہے۔ انسانی ذہن بھی اسی کے سہارے اپنے مقدس فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ قانون اس کائنات کی ایک نہایت ہی ٹھوس حقیقت ہے۔

میں نے بعض سائنس دانوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ علت و معلول کا سلسلہ وہاں ختم

ہو جاتا ہے جہاں ماورائے ادراک کی دنیا شروع ہوتی ہے یا غور و فکر کے متعارف اصولوں کو عملی زندگی پر منطبق کرنا مقصود ہوتا ہے۔ میں اس بات کو عقل و فکر کے منافی سمجھتا ہوں کہ کوئی انسان علت و معلول کے اصول کو اُس وقت تک کام میں لاتا رہے جب تک اُسے اپنے نظریہ کی تائید مقصود ہو اور جس مقام سے یہ اُس کے بنیادی تصور کا ساتھ دینا چھوڑ دے تو وہ بھی اسے خیر باد کہہ دے۔ علت و معلول کی لمبی زنجیر میں ایک مابعد الطبیعی حلقہ کا اضافہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ ہم سائنس اور روزمرہ کے دوسرے مسائل میں اسی طریق سے کام لیتے ہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ وہ حلقہ صحیح بھی ہو لیکن جو انسان اس کی صحت پر غور و فکر کرنے کے لیے تیار ہے اُس کے لیے پہلے اُس کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

خدا سے باغی لوگوں کے افکار و نظریات کا سرسری جائزہ لینے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دماغوں میں کچھ ایسا فتور ہے کہ وہ اس سادہ سی حقیقت کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کائنات کی علتِ غائی خدا کی معرفت کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہے اور اگر اس ذات کا انکار کر دیا جائے تو یہ سارا نظامِ عالم ایک ناقابلِ فہم معمہ بن جاتا ہے۔ آئن شٹائن نے کس قدر درست کہا تھا: "وہ شخص جو اپنی زندگی اور ابنائے نوع کی زندگی کو بالکل بے مقصد سمجھتا ہے وہ نہ صرف بدنصیب اور نامراد ہے بلکہ اسے زندگی گزارنے کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں۔" آئن شٹائن کے اس بیان پر میں صرف اسی قدر اضافہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ایسے شخص کو زندگی بسر کرنے کا صرف اس لیے موقع دینا چاہیے کہ ممکن ہے وہ الحاد کے بعد ایمان کی طرف لوٹ آئے۔

اب میں اپنے ایک سائنس دان بھائی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس کی ذہانت اور فطانت کا میں اور میری طرح کے بہت سے دوسرے لوگ دل و جان سے معترف ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اُس سے یہ سوال کیا "خداوند تعالیٰ کے بارے میں مندرجہ بالا سطور میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے کیا وہ صحیح اور درست ہے؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا لیکن اُس کے بعد وہ مجھ سے خدا کی صفات کے متعلق مختلف قسم کے سوالات پوچھنے لگا۔

میرے نزدیک اُس کی یہ فکری روش بالکل صحیح اور درست ہے۔ جو شخص بھی ان مسائل کے متعلق سوچنا شروع کرتا ہے اُس کے ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا فی الواقع ہے، اس کے بعد وہ اس کی صفات کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے کا آرزومند ہوتا ہے، پھر وہ حیاتِ انسانی کے مقصد و مدعا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر میں وہ خیر و شر کے عقدہ کو حل کرنے کے لیے بیتاب دکھائی دیتا ہے۔

صفاتِ الٰہی | قدیم فلاسفہ اور حکماء نے صفاتِ باری تعالیٰ پر منطقی طرزِ استدلال کے ساتھ بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان صفات کا جو کافی حد تک نامکمل ہیں۔ ہم ذیل میں تذکرہ کرتے ہیں۔

خدا ایک حی و قیوم ہستی ہے جسے کبھی فنا نہیں جو نہ تو مادہ ہے، نہ کوئی جسم رکھتی ہے اُسے بخت و اتفاق سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مکمل و اکمل ذات ہے۔ ساری نیکیوں کا واحد سرچشمہ اور مبرا عن الخطا۔ اس سے کسی برائی کا صدور ممکن ہی نہیں۔ وہ کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ اپنی ذات میں لامحدود ہے۔ وہ ایک خالص سچائی ہے۔ اُس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ خدا محبت اور مشیت کا مظہر ہے۔ اُسے نہ تو بھوک لگتی ہے اور نہ ہی پیاس محسوس ہوتی ہے۔ سارے اخلاقی ضابطوں اور نیک اعمال کا وہ منبع اور مبداء ہے۔

اخلاقی علت | خدا پر ایمان لانے کے کئی وجوہ ہیں۔ ان میں اخلاقی علت اور ارادہ و اختیار کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس چیز سے میری مراد یہ ہے کہ انسان فکر و عمل کے معاملے میں خود مختار ہے۔

حیاتِ انسانی کا روحانی اور اخلاقی پہلو — یعنی اُسے کیا کرنا چاہیے، انسانی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے تسخیرِ کائنات سے بھی کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ علومِ طبیعی کا مطالعہ ہمیں اس کائنات کے بہت سے اسرار و رموز سے آشنا کرتا ہے اور ہمیں وہ ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن سے کام لے کر ہم مال و دولت میں اضافہ کر سکتے ہیں اور اس کی بہتر اور منصفانہ تقسیم کے لیے نئی نئی تدابیر اور راہیں نکالنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر انہی قوانین کی مدد سے ہم

ایسے وسائل بھی مہیا کرتے ہیں جن سے انسانی مصائب اور شدائد میں کمی واقع ہوتی ہے اور لوگوں کی عمریں دراز ہوتی ہیں۔ دورِ جدید کا سب سے اہم مسئلہ اخلاقی اور روحانی ہے۔ ہمیں اس وقت سب سے زیادہ جس چیز کی فکر لاحق ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح سائنسی قوت کو بنی نوع انسان کی تباہی اور بربادی پر صرف کرنے کی بجائے اُسے انسانی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ماضی میں انسانیت کو جب کبھی بھی اہم مسائل سے سابقہ پیش آیا تو اُن کی نوعیت سراسر اخلاقی تھی۔

عالم طبیعیات ناقابلِ تغیر اصولوں کا پابند ہے۔ یہی حال حیوانوں کا ہے۔ وہ بھی فطرت کے لگے بندھے ضابطوں کے تحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ خالقِ کائنات نے نوع بشری کو اس سے بہت ارفع و اعلیٰ بنایا ہے کہ وہ بے حس تقیدات کی غلام ہو اور اسے فکر و عمل کی کوئی آزادی نہ دی جائے۔ انسانی معاشرہ اُن افراد پر مشتمل ہے جو ارادہ و اختیار رکھتے ہیں اگر چاہیں تو شجرِ علم سے بہرہ مند ہوں اور چاہیں تو اجتناب کریں۔ اگر ہم قادرِ مطلق کے اخلاقی قوانین کی پابندی نہیں کرتے تو ہمیں اس کے نتائج خود بھگتنے پڑیں گے۔ اگر عالم طبیعیات کو بھی ارادہ و اختیار کی نعمت سے نوازا جاتا تو پھر انسانی آزادی بے معنی ہوتی — اور یہ ساری کائنات آناً فاناً زیر و زبر ہو کر رہ جاتی۔

جانوروں کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی سطح سے نیچے جتنی جاندار مخلوق ہے وہ قدرت کے مندرجہ ذیل دو اصولوں کی پابند ہے:

۱۔ بقائے نفس

۲۔ ابقائے نوع

اگر یہ دو اصول کارفرما نہ ہوتے تو کوئی نوع زندہ نہ رہ سکتی۔ جانوروں کی ساری حرکات جبلتوں کے محور پر گھومتی ہیں لیکن جوں جوں ہم حیوانی سطح سے بلند ہوتے چلے جاتے ہیں اسی قدر ہمارے افعال و اعمال پر شعور و آگہی کا تسلط ہونا شروع ہوتا ہے۔ ابھی تک اس امر کا فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ کیا حیوانوں کو بھی ارادہ و اختیار کی دولت میں کوئی حصہ ملا ہے؟ اگر کچھ ملا بھی ہے تو وہ بہت کم ہے

اس بنا پر اگر کوئی جانور اپنے جسم کی حفاظت اور پاسبانی کرتا ہے تو اُس کی غرض و غایت بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی نوع کو زندہ رکھ سکے۔ وہ جنگل کے قانون کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں، وہ ایسے بے لچک اصولوں کے پابند ہوتے ہیں جن میں کسی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان آغاز ہی سے فطرت کے ان ضابطوں کے علاوہ بعض دوسرے اصولوں کا بھی پابند چلا آ رہا ہے۔ وہ جب کسی عجیب و غریب شے کو دیکھتا ہے تو حیرت زدہ ہو جاتا ہے، اُس سے جب کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اُس کے اندر۔ احساسِ ندامت انگڑائی لیتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جو قوت اُسے حیران اور پریشان کر رہی ہے وہ اُن افعال و اعمال کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی جو گناہ کے دائرہ میں آتے ہیں۔

درندوں اور چوپاؤں سے لیکر اگر انسان جیسی اشرف المخلوقات نوع کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ارتقاء کی ان مختلف منازل کے درمیان خطِ امتیاز صرف ارادہ اور اختیار ہے اور اسی کے ذریعہ انسان اپنے ماحول کی تسخیر اور اپنے آپ کی تسخیر کا سبق حاصل کرتا ہے۔ انسان کو فیصلے کی جو آزادی حاصل ہے اسی کی آغوش میں خیر و شر کے احساسات پرورش پاتے ہیں۔

علت کی اس لمبی زنجیر کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ کیا یہ زنجیر یونہی بخت و اتفاق سے شروع ہو گئی۔ جس طرح انسان کا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اچانک فرش پر پانی گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہو جائے اسی طرح عقل یہ چیز بھی باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ علت کی یہ زنجیر یونہی بن گئی مجھے یہ تسلیم کرنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ قانونِ علت جو عالمِ طبعیات میں کارفرما ہے جس کے تحت نباتات، اور حیوانات زندگی بسر کرتے ہیں، اور جس کے ذریعہ انسانی ذہن نے نشوونما پائی ہے، وہ ہمیں اخلاقی اور روحانی اقدار کے معاملے میں بھی رہنمائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر محبت، عدل و انصاف، رحم، خالق کے مخلوق پر حقوق یہ وہ اعلیٰ اقدار ہیں جنھیں نہ تو گنا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں ماپا اور تولا جا سکتا ہے۔ میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا

ہوں کہ انسانیت کے مستقبل کا سارا دارومدار اسی فیصلہ پر ہے کہ کیا وہ ان ابدی اقدارِ حیات کو اپنانے پر تیار ہو گی یا نہیں۔ بنیادی ضروریات حاصل ہو جانے کے بعد انسان اگر صحیح معنوں میں سکون اور طمانیت کا متمنی ہے تو اسے لازمی طور پر انہیں روحانی اور اخلاقی چیزوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

تاریخی شواہد کا جائزہ لینے اور مسلسل غور و فکر کے بعد میرا دل اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے کہ ایک انسان اخلاقی اقدار کو صرف اسی صورت میں اپنانے کے لیے تیار ہوتا ہے جب اسے اس بات کا یقین کامل ہو کہ ایک قادرِ مطلق ہستی جو ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے وہ انسان کے فکر و عمل کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس کائنات میں نظم و ترتیب کی موجودگی اور قانونِ علت کی فرمانروائی کے محض اعتراف سے مذہب کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ مذہب کی حد تو اس احساس سے شروع ہوتی ہے کہ انسان کو اپنی روزمرہ زندگی میں خدا کے پیش کردہ ضابطۂ حیات کا پورا پورا احترام کرنا چاہیے۔ گزشتہ سالوں کے روح فرسا واقعات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اخلاق، حق و انصاف اور آزادی کی بنیاد اگر خدا ترسی پر قائم نہ ہو تو اس سے نہایت ہی خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ نوعِ بشری کے لیے سکون اور اطمینان کی زندگی صرف خدا پرستانہ ماحول ہی میں ممکن ہے۔ انسانیت کے اندر مساوات کی روح اخلاقی قوانین ہی سے بیدار ہوتی ہے۔ اگر خدا کا تصور نظروں سے اوجھل ہو جائے یا اخلاق کے حتمی ضابطے ختم کر دیئے جائیں تو پھر غلامی کے خلاف، ظلم و تعدی اور انسان کی حرص و ہوا کے خلاف کوئی دلیل بھی درست نہیں مانی جا سکتی۔ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان کوئی پائیدار اخلاقی اقدار نہیں رکھتا، اُسے فکر و عمل کی کوئی آزادی نہیں، اُسے کوئی مستقل حقوق بھی حاصل نہیں تو اس سے انسان خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ انسانیت خارجی حالات کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے اور اس کے وہ افراد جنہیں قدرت کی طرف سے ذہانت اور فطانت کا وافر حصّہ ملا ہے وہ اگر کمزور اور بے بس لوگوں کو اپنے ظلم کا تختۂ مشق بناتے ہیں تو وہ بالکل حق بجانب ہیں۔ انسان اگر کسی مستقل حیثیت کا دعویدار ہے

اسے اگر کوئی دائمی شرف اور وقار حاصل ہے تو وہ محض اس بنا پر ہے کہ وہ خدا کی مخلوق ہے
خدا پر ایمان لائے بغیر انسانی شرف کا تصور بالکل بے معنی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔

امریکہ آج جن حالات سے گذر رہا ہے وہ انتہائی افسوسناک ہیں۔ ہمیں ہر لمحہ اس بات کا شدید احساس ہو رہا ہے کہ یہاں کے باشندوں میں جمہوری روح دن بدن کمزور پڑتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ میرے نزدیک صرف ایک ہی ہے کہ نئی دنیا کا یہ سرسبز و شاداب خطہ غیر محسوس طور پر الحاد کے نرغے میں گھر رہا ہے اور اسی بنا پر اس کی مذہبی اور روحانی بنیادوں میں ایک زلزل سا پیدا ہو گیا ہے۔ دنیائے مغرب اس بات کے لیے انتہائی کوشاں ہے کہ کسی طرح انسانی حقوق کو ان روحانی سرچشموں سے منقطع کر دیا جائے جو الہامی مذہب کے منبع سے نکلتے ہیں اور پھر انہیں مستقل اور پائیدار بھی بنایا جاسکے۔ لیکن یہ چیز ناممکنات میں سے ہے۔ روحانیت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے کے بعد اخلاق کی سر بفلک عمارت کو اپنی جگہ پر قائم رکھنا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ انسانیت نے بارہا اس حماقت کو آزمایا اور ہمیشہ منہ کی کھائی۔

تعارفِ کُتب

INDIA WINS FREEDOM
(انگریزی) ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے
از مولانا آزاد مرحوم و مغفور

دنیا کی بزم آرائی بلاشبہ کسی فرد یا چند افراد سے وابستہ نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی رہینِ منت ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس بزم کے مختلف شرکار کے کردار ایک جیسے نہیں ہوتے اور اہمیت کے اعتبار سے ان کے درمیان بڑی آسانی کے ساتھ ایک واضح خطِ امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔

اس کرۂ ارضی پر ایک بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو زندگی کے ڈرامے میں محض شمولیت کو ہی اپنا کمال سمجھتے ہیں، ان کا کام اتنا عام اور رنگا بندھا ہوتا ہے کہ انسان اس میں کوئی کشش یا جاذبیت نہیں پاتا۔ اس لیے نہ تو کوئی آنکھ اُن کی طرف اُٹھتی ہے اور نہ ہی کوئی دل اُن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں اور اپنی ذاتی آرزوؤں اور تمناؤں کے پیچھے گھوم پھر کر زندگی کی سرحد کو عبور کر جاتے ہیں۔ وہ قافلہ انسانیت کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ ان لاتعداد افراد کے برعکس کبھی کبھی انسانیت کی سطح پر ایسی شخصیتیں بھی نمودار ہوتی ہیں جنہیں بھیڑ میں چلنا گوارہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے لیے الگ راستہ بنانے کی جدوجہد کرتی ہیں۔ وہ انسانیت سے کچھ لیتی نہیں بلکہ اُسے اپنے فکر و عمل سے مالا مال کرتی ہیں۔ انہیں چند خوش نصیب لوگوں میں ایک ذات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کی بھی ہے۔ مولانا کے طرزِ فکر سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے اُن کی سیاسی روش پر بھی ایک شخص گرفت کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا انسانیت کی ایک نہایت قیمتی متاع تھے۔ اُن کا اپنے مقصد کے ساتھ عشق، ان کی ذہانت و فطانت، اُن کی شعلہ بیانی، ان کا تبحرِ علمی، ان کی حق گوئی و بیباکی، اُن کا ایثار اور عزم یہ ایسی قابلِ قدر صفات ہیں جو ہر شخص سے خراجِ عقیدت حاصل

کرتی ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں ایک عرصہ دراز سے یہ خواہش تھی کہ وہ اس یگانۂ روزگار انسان کے ذہنی تاثرات اور قلبی واردات کو بغیر کسی واسطہ کے معلوم کریں۔

ان کی شخصیت کی کچھ جھلکیاں تو ان کی ساری تصنیفات میں مل سکتی ہیں۔ تذکرہ اور غبارِ خاطر اس معاملے میں سب سے نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے قریبی دوستوں اور عقیدتمندوں نے بھی ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر سے پردے اٹھائے ہیں لیکن ان سب کی موجودگی کے ہوتے ہوئے بھی ہر انسان اس بات کا آرزومند تھا کہ اُن کی ذات کا کوئی ایسا مرقع ہاتھ آئے جو انہوں نے اپنے قلم سے تیار کیا ہو۔ یہی وہ احساس تھا جس نے مسٹر ہمایوں کبیر کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مولانا کو اپنی سوانح حیات لکھنے پر آمادہ کریں۔ مولانا پہلے تو اس بات پر راضی نہ ہوئے لیکن جب اس کا بار بار تقاضا کیا گیا اور انہیں اس بات کا یقین دلایا گیا کہ اس کتاب کے لکھنے کی زحمت انہیں اٹھانا نہیں پڑے گی تو وہ تیار ہو گئے۔

زیرِ نظر کتاب ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے گو مولانا کی پوری داستانِ حیات نہیں لیکن یہ اُن کی زندگی کے ایک نہایت اہم دور کی قیمتی دستاویز ضرور ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں کون کون سے لوگ کس حیثیت سے شریک ہوئے۔ اُن میں کونسی خوبیاں اور خامیاں تھیں اور کس طرح بسا اوقات ذرا سی غلطی نے حالات کا رُخ بالکل ایک دوسری سمت میں پھیر دیا۔

کتاب کے پہلے باب میں مولانا نے اپنے خاندانی حالات اور اپنی ابتدائی زندگی کو بیان فرمایا ہے۔ وہ ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے دو برس بعد ان کے والد محترم کلکتہ تشریف لے آئے۔ مولانا نے اپنی ساری تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو سرسید کی تحریروں سے متعارف ہو گئے اور ان کے مطالعہ کے بعد انہیں اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ دورِ حاضر میں کوئی شخص اس وقت تک صحیح معنوں میں اہلِ علم نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ جدید سائنس، فلسفہ اور ادب سے پوری طرح باخبر نہیں ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے

انگریزی پڑھنی شروع کی اور اس کو سیکھ لینے کے بعد تاریخ و فلسفہ کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔

ان مغربی علوم نے اُن کے قلب اور دماغ کو شدید طور پر متاثر کیا اور اُن کے ذہن میں اُن معتقدات کے بارے میں عجیب و غریب شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہوئے جن سے وہ اوائل عمر میں آشنا ہوئے تھے۔ اپنی اس ذہنی کیفیت کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"میرا یہ دور ایک زبردست ذہنی بحران کا دور تھا۔ میں نے ایک ایسے خاندان میں جنم لیا اور ایک ایسے ماحول کی آغوش میں پرورش پائی جو مذہبی روایات کا بڑی سختی کے ساتھ پابند تھا۔ روایتی زندگی کے سارے ضوابط بلا چون و چرا قبول کرنے پڑتے تھے اور اہلِ خاندان پرانے طور طریقوں سے سرِ مو انحراف کو بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن ان مروجہ رسومات اور عقائد کو قبول کرنے پر میرا دل کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ اسی لیے میرے اندر ایک بغاوت کا جذبہ نمودار ہوا۔ وہ خیالات جو میں نے اپنے خاندان والوں سے اور ابتدائی تعلیم سے حاصل کیے تھے وہ اب میرے لیے موجبِ اطمینان نہ تھے۔ میرے اندر بالکل غیر شعوری طور پر یہ احساس اُبھرنے لگا کہ مجھے خود حق کی تلاش کرنی چاہیے۔ اس لیے بالکل غیر ارادی طور پر میں اپنے خاندانی اثر سے آزاد ہوتا چلا گیا اور اپنی ایک الگ دنیا آباد کرنے کا فیصلہ کیا۔ "آزاد" کا لفظ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

قریب قریب سترہ سال کی عمر میں مولانا نے سیاست کے خارزاروں میں قدم رکھا۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا کہ مسلمان اپنے اصل مقصد کو بھول چکا ہے اور خوابِ غفلت میں مدہوش پڑا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کیا۔ الہلال اخبار نہ تھا بلکہ رعد تھا جس کی کڑک نے ہندوستان کی پوری زمین ہلا دی۔ اس اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دو سال کے عرصہ میں اس کی اشاعت ۲۶ ہزار تک جا پہنچی۔ جو لوگ سر سید کے طرزِ خیال کے حامی تھے۔ انہوں نے مولانا کے افکار و نظریات کی مخالفت کرنا چاہی لیکن انہیں اس

معاملہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو حکومت نے اس مجلہ کو ضبط کر لیا۔ پانچ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد مولانا نے ایک دوسرا پرچہ البلاغ شائع کیا۔ حکومت نے اس وقت اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ اس شخص کو بار بار ضمانت ضبط کر کے دھمکایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے انہیں اپریل ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا سے نظر بندی اٹھالی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کے سیاسی افق پر گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور حکیم اجمل خاں نمودار ہو رہے تھے۔ مولانا نے ان حضرات کے ساتھ مل کر تحریکِ خلافت میں کام کرنا شروع کیا۔

اس کتاب میں مولانا نے بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ کانگرس میں پٹیل ایک زبردست قوت کا مالک تھا اس نے بمبئی کے ایک مشہور پارسی لیڈر نریمان کی سیاسی زندگی برباد کی، بنگال کا مشہور رہنما سی آر داس بھی اسی شخص کی سازشوں کا شکار ہوا اور بھولا بھائی ڈیسائی کو بھی سیاسی طور پر ختم کرنے میں اس شخص نے نہایت شرمناک کھیل کھیلا۔ ڈیسائی کو جس طرح راستے سے ہٹایا گیا اس کی تفصیل سیاسی تاریخ میں ایک بڑی عبرتناک داستان ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کی رہائی کے بعد لوگوں میں یہ احساس شدت سے ابھرنے لگا کہ اگر کانگرس اور مسلم لیگ میں مصالحت ہو جائے تو اس سے آزادی کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے اس گفت و شنید کے لیے لیاقت علی خاں مقرر ہوئے اور کانگرس نے یہ ذمہ داری مسٹر ڈیسائی پر ڈالی۔ اس وقت بجز گاندھی جی کانگرس کے سارے زعما جیل میں تھے۔ ڈیسائی نے گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہو کر اس گفت و شنید کے سارے نشیب و فراز سے انہیں آگاہ کیا۔ مسٹر گاندھی نے اس دن چونکہ خاموشی کا برت رکھا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے زبانی جواب دینے کی بجائے لکھ کر کہا کہ ڈیسائی مصالحت کی اس کوشش کو جاری رکھیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر یہ کوشش ناکام رہی۔ ۱۹۴۵ء میں جب کانگرس کے رہنما رہا ہوئے تو اس کارروائی پر زبردست ہنگامہ ہوا اور اس ناکامی کی ساری ذمہ داری بڑی بے انصافی کے ساتھ ڈیسائی کے سر تھوپ دی گئی۔ اس مظلوم سیاسی

کارکن نے اس واقعہ سے جو شدید تاثر لیا اُس کو مولانا کے الفاظ میں ہی سنیے :

"اس واقعہ سے مسٹر ڈیسائی کو شدید صدمہ پہنچا اور ان کی صحت تباہ ہو گئی۔ انہیں پہلے بھی دل کا عارضہ تھا لیکن اس حادثہ کے بعد مرض نے شدت اختیار کر لی۔ انہیں رہ رہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ انہوں نے کس اخلاص کے ساتھ کانگرس کی خدمت کی ہے لیکن انہیں اس کا صلہ کیا ملا ہے، صرف ذلت اور رسوائی۔ میں جس وقت بمبئی گیا تو حسب معمول انہیں کے ہاں ٹھہرا۔ اس وقت وہ صاحب فراش تھے۔ جب میں نے ان سے ان کی حالتِ زار معلوم کرنا چاہی تو انہیں یارائے ضبط نہ رہا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انہیں سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ گاندھی جی نے بھی جنہیں سب واقعات کا پوری طرح علم تھا انہیں معترضین اور مخالفین سے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں نے مسٹر ڈیسائی کو تسلی دینی چاہی لیکن بے سود"

مسٹر ڈیسائی کے دل پر جو گزری ہو گی اُس کا اندازہ ہر مخلص کارکن بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کارکن کے لیے اس سے زیادہ باعثِ اذیت اور کوئی چیز نہیں ہوتی کہ اس کے رفقاء اُسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں اور خصوصاً اُس کا رہنما اس پر اعتماد نہ کرے۔ اپنے ساتھیوں کی رفاقت اور اپنے لیڈر کا اعتماد ہی دراصل وہ دو زبردست سہارے ہیں جن کے بل پر وہ وقت کے جباروں اور قہاروں سے لڑ جاتا ہے۔ وہ مقصد کے حصول کی خاطر فاقہ کشی برداشت کر سکتا ہے، قید و بند کی صعوبتیں بڑی خندہ پیشانی سے جھیل لیتا ہے اور اگر وقت آن پڑے تو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیتا ہے۔ لیکن اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اُس کے ہم سفر اور اس کا قائد اس سے بدظن ہوں۔ اعتماد کا کھو جانا ہر مخلص کارکن کی روحانی اور اخلاقی موت ہوتی ہے۔

پھر اس عبرتناک داستان میں ہمیں ان گھٹیا ہتھکنڈوں کا بھی پتہ چلتا ہے جن کو کام میں لا کر طالع آزما ہر بڑے آدمی کو ورغلاتے اور اپنے ساتھیوں سے بدظن کرتے ہیں۔

سردار پٹیل نے تقسیم ملک کے بعد گاندھی جی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی بڑی افسوسناک داستان ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"ایک چیز جو گاندھی جی کے ذہن کو ہمیشہ مضطرب اور پریشان کرتی وہ سردار پٹیل کا رویہ تھا۔ یہ شخص گاندھی جی کے نہایت قریبی حلقے کا آدمی تھا اور وہ اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سردار پٹیل اپنی سیاسی زندگی کے وجود کے لیے ہی گاندھی جی کا دست نگر ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ کانگرس کے لیڈروں میں بعض ایسے بھی تھے جو گاندھی جی سے پہلے سیاسی میدان میں اتر چکے تھے۔ سردار پٹیل عدم تعاون کی تحریک سے پیشتر گجرات میں ایک معمولی وکیل تھا۔ جب گاندھی جی نے احمد آباد میں سکونت اختیار کی تو ان کی نگاہِ التفات سردار پٹیل پر پڑی۔ اور اس کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اس شخص کی سیاسی حیثیت کو مضبوط اور مستحکم کرنا شروع کیا۔ پٹیل گاندھی جی کا جان نثار فدائی بن گیا اور ہمیشہ اپنی رائے ان ہی کے اشاروں سے بناتا۔ گاندھی جی نے اسے مجلس عاملہ کا رکن بنوایا اور ان کی خواہش پر ہی وہ ۱۹۳۱ء میں کانگرس کا صدر چُنا گیا۔

تقسیم کے بعد پٹیل نے مسلمانوں کے معاملے میں ایک ایسا طرز عمل اختیار کیا جس سے گاندھی جی کو سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے مرن برت کا فیصلہ کیا۔ برت کے پہلے روز میں، سردار پٹیل اور پنڈت نہرو تینوں ان کے پاس عصر کے وقت گئے۔ باتوں باتوں میں پٹیل نے کہا کہ گاندھی جی اپنے رویہ سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے قتل و غارت کا ذمہ دار براہِ راست میں ہوں۔ اُس کے الفاظ سے کہیں زیادہ اس کے لب و لہجہ پر مجھے دکھ ہوا اور ہم نے اس معاملہ میں اسے کچھ مزید کہنا بالکل بیکار خیال کیا۔"

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک واضح تاثر جو انسان کے ذہن پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کانگرس میں اصلی مرضی صرف گاندھی جی کی چلتی تھی۔ مولانا نے اس حقیقت کا بڑے واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ لیکن گاندھی جی کی رائے بنانے اور تبدیل کرنے میں سب سے

زیادہ دخل سردار پٹیل کو حاصل تھا۔ چنانچہ دیکھیے کہ جب اُس نے تقسیم ملک کو قبول کر لیا تو اس کے بعد سارے لوگوں کو اسے تسلیم کرنا پڑا اور یہ سب قریب قریب وہی دلائل دیتے تھے جو سردار پٹیل نے اس موقع پر پیش کیے۔ پٹیل یہ کہتا کہ ہم خواہ اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر ہندوستان میں دو قومیں ہی آباد ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاع کو ختم کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔

مولانا نے کانگرس کی عدمِ تشدد کی پالیسی پر بھی چوٹ کی ہے اور کہا ہے کہ عدم تشدد کے حامی اب تقریباً دو کروڑ روپیہ سالانہ فوج پر خرچ کر رہے ہیں۔

اس کتاب میں بعض باتیں ایسی ہیں جو ایک قاری کو سخت الجھن میں ڈالتی ہیں۔ ہمایوں کبیر صاحب جو اس کتاب کے مرتب ہیں وہ کتاب کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ مولانا نے اس کتاب کا ایک ایک فقرہ پڑھا ہے اور اسے ان کی تصویب و توثیق حاصل ہے لیکن اس میں بعض ایسی نمایاں غلطیاں ہیں جنہیں دیکھ کر کبیر صاحب کے اس دعوے کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً کتاب کے پہلے صفحہ پر ہی مرتب لکھتے ہیں کہ مولانا کی والدہ محترمہ حضرت شیخ احمد ظاہر وتری کی بیٹی تھیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ تذکرہ میں مولانا نے صاف فرمایا ہے کہ اُن کی والدہ محترمہ حضرت شیخ محمد بن ظاہر وتری مفتی مدینہ منورہ کی بھانجی تھیں۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو اس کتاب کے بارے میں بہت سے شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے۔ اگر مولانا نے اس کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھا ہوتا تو اس نوعیت کی غلطی نہ ہوتی۔

پھر اس کتاب میں ہمیں بہت سی چیزیں ایسی بھی ملتی ہیں جن سے ہمیں اتفاق نہیں ہو سکتا مثلاً یہ دعویٰ کہ ۱۹۳۵ء کے بعد جب کانگرس برسرِ اقتدار آئی تو کسی مسلمان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں کی گئی بہت حد تک محلِ نظر ہے۔ ظلم و زیادتی کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ خطرناک صورت وہ ہے جب کہ ایک قوم کے قومی وجود کو ہی مٹا دینے کا عزم کر لیا جائے۔ دین کے ساتھ اس قوم کا جو رشتہ ہے وہ مولانا سے

پوشیدہ نہیں۔ ہندو ماتزم اور واردھا کی تعلیمی اسکیم کے ذریعہ جس طریق سے مسلمانوں کے اجتماعی تخیلات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی اُسے اگر ظلم نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟

یوں تو اختلاف کے بہت سے گوشے ہیں لیکن کتاب کے بالکل آخر میں یہ چند فقرے پڑھ کر دل کو شدید صدمہ ہوا۔ تقسیم ملک کے کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لانا فرماتے ہیں

"مسٹر جناح اور ان کے ماننے والوں کو اس حقیقت کا احساس نہ ہوا کہ جغرافیہ اُن کا ساتھ نہیں دے رہا۔ ہندوستان میں مسلمان اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ وہ ایک خطہ میں اپنی الگ ریاست قائم نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کی اکثریت یا تو شمال مغرب میں آباد ہے یا شمال مشرق میں ان دونوں خطوں کے درمیان کوئی ارضی تعلق نہیں۔ ان دونوں جگہوں کے رہنے والے سوائے مذہب کے ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس سے بڑا فریب اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ وہ خطے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور تمدنی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں انہیں مذہب کا رشتۂ اتحاد ایک دوسرے سے مربوط کر سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ماضی میں اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے ماورا تھا، لیکن تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پہلے چند سالوں میں زیادہ سے زیادہ پہلی ایک صدی کے بعد اسلام صرف اپنی قوت اور طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کے مختلف ممالک کو ایک ریاست بنانے میں ناکام رہا۔"

سچی بات یہ ہے کہ طبیعت یہ باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ اسلام کے بارے میں اس حد تک بے اعتمادی اور بے یقینی اُس شخص کے اندر بھی پیدا ہو سکتی ہے جو کسی زمانہ میں اس سرزمین میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ یہ اندازِ فکر مرتب کا اپنا دکھائی دیتا ہے اور اس قسم کے احساسات کا اظہار وہ مختلف موقعوں پر کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔

۵

کتاب میں بعض ایسی فاش غلطیاں ہیں جنہیں دیکھ کر یہ بات کسی قدر وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولانا مرحوم کو اس کتاب کے مسودہ پر نظر ثانی کا اچھی طرح موقع نہیں ملا۔ کاش مولانا خود اپنے قلم سے اپنی سرگزشت رقم فرماتے۔ کسی دوسرے شخص کو اپنے خیالات و احساسات کا ترجمان بنانا بالکل مردہ بدست زندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا کی زندگی کے بہت سے دوسرے حادثات کی طرح یہ بھی ایک حادثہ ہے کہ وہ شخص جس نے نصف صدی سے کچھ اوپر نثر کے میدان میں بڑی فراوانی کے ساتھ گوہر لٹائے، جس نے اردو ادب کے سبزہ زاروں میں حسنِ تخیل، لطافتِ بیان اور جذبات و احساسات کے پھول کھلائے وہ آج اپنی حکایت بیان کرنے کے لیے کسی دوسرے کے قلم کا محتاج ہے۔

کتاب ہندوستان میں ادرینٹ لانگ مین (دہلی) نے شائع کی ہے اور قیمت ساڑھے بارہ روپے ہے، پاکستان میں یہ کتاب غالباً فروخت کے لیے نہیں آئی۔

ضروری اعلان

(۱) ماہنامہ ترجمان القرآن کے ایجنٹوں کی خدمت میں درخواست ہے کہ اگر ان کے پاس ماہ جنوری ۶۰ء کے پرچے بچے ہوئے ہوں تو دفتر ترجمان القرآن کو بھیج دیں۔ اُسی کمیشن پر واپس لے لیے جائیں گے جس پر بھیجے گئے تھے۔ پرچے بھیجنے سے قبل دفتر کو اطلاع دینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ماہ رجب ۱۳۷۵ھ کے ترجمان القرآن کے پرچے بھی بچے ہوئے ہوں تو وہ بھی ارسال کر دیں۔

(۲) خریدار صاحبان کو اپنا پتہ تبدیل کرانے کے لیے سابقہ پتہ ضرور لکھنا چاہیے۔ اسی طرح منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر اپنا نمبر خریداری اور پتہ صاف تحریر فرمائیں۔ ورنہ عدم تعمیل کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔ نئے خریدار صاحبان بھی اپنا مکمل پتہ خوشخط اور صاف لکھ کر بھیجا کریں۔ اور ساتھ ہی جس ماہ سے پرچہ جاری کرانا ہو اس کا نام لکھا کریں۔

چراغ الدین منیجر ترجمان القرآن

مطبوعات

حیاتِ مجددؒ تالیف پروفیسر محمد زمان صاحب۔ شائع کردہ مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور۔ قیمت ۵ روپے۔ صفحات ۲۹۱۔

حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن ان کے مطالعہ سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنفین کسی حد تک افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں کسی نے تعریف کو تعریف بیجا کی حد تک پہنچا دیا ہے کسی نے نئے تنقیدی زاویوں سے کام لیکر بیجا نکتہ چینی کر ڈالی ہے اور کہیں کہیں دیدہ دلیری اور شوخ چشمی کی حدود کو چھو لیا ہے۔ مثلاً "زبدۃ المقامات" میں کرامات کا بہت زیادہ ذکر ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کہیں کہیں طبیعت پر گراں گزرنے لگتا ہے "مقامات امام ربانی" میں عادات و اطوار وغیرہ کا ذکر ہے اس میں بھی صاف مبالغہ اور غلو کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسی طرح "مقاماتِ احمدیہ" میں بھی تعریف میں غلو اور کرامات کا بہت زیادہ ذکر ہے "جواہرِ مجددیہ" کا بھی کم و بیش یہی عالم ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے اپنی کتاب "رودِ کوثر" میں بزعم خود سوانح کے جدید رجحانات کی روشنی میں تنقید کی ہے جس میں شاید انہوں نے تنقیص کو تنقید کا لازمی جزو خیال کرتے ہوئے کچھ ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو کھٹکتی ہیں اور اقدام بیجا معلوم ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس میں "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر عمل کرکے ایک متوازن رجحان کے ساتھ شیخ سرہندی کی زندگی کا جائزہ لیا جاتا تاکہ بقول فرمان صاحب "ایک تو جدید مزاج کے لیے ایک طرح کی صحیح معلومات پیش ہو جائیں اور دوسرے قدیم رجحانات رکھنے والے حضرات کے لیے ایک متوسط راستہ متعین ہونے کا امکان روشن ہو" اور حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے قدیم و جدید طرز سوانح نگاری کو متذکرہ بالا کتاب میں بڑے سلیقہ سے

یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ بڑی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں۔

شیخ احمدؒ سرہندی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اپنے زمانہ میں انہوں نے ذاتی طور پر اسلام کی اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ انتقال کے بعد ان کے آثار اور افکار اسی خدمت کو آج تک انجام دے رہے ہیں۔ ان کے بڑے کارنامے تین کہے جا سکتے ہیں یعنی ردِّ بدعت۔ ترویج شریعت اور اصلاحِ تصوف۔ ان کی ان خدمات کی قدر ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جبکہ ہم ان کے زمانہ پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ اس دور میں مسلمانوں کے معاشرے اور ایمان میں کس قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ مثلاً تصوف کو ہی لیجیے، اسے سہل انگار لوگوں نے اپنی بدعنوانیوں کا پردہ بنایا اور اس کی آڑ لے کر ترکِ شریعت کے لیے جواز پیدا کر لیا۔ اس سلسلہ میں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ متصوفہ میں ایک فرقہ ہے جس کو خود اہلِ فرقہ ملامتیہ کہتے ہیں۔ وہ ہر خلافِ شریعت عیب کو ثواب سمجھتے ہیں اور وجہِ جواز یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح نفس میں عجب اور تکبر دُور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ زمین پر لوٹیں گے۔ گندے رہیں گے۔ افیم۔ گانجہ۔ چرس وغیرہ استعمال کریں گے اور بہت سے منکرات میں ملوث ہوں گے۔ تاکہ لوگ انہیں ملامت کریں اور ان کے اندر کبرِ نفس پیدا نہ ہونے پاتے۔

حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ نے وحدت الوجود کے مسئلہ کی بھی بڑے زوردار الفاظ میں تردید کی ہے مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق فرمان صاحب نے بجا طور پر فرمایا ہے "دین اسلام اور تصوف میں جو بُعد واقع ہو گیا تھا اس کی ابتدا کی نشاندہی کے لیے ہمیں وحدت الوجود کے مسئلہ پر غور کرنا ہے۔ اس مقام سے نادانستہ طور پر جمود و تعطل کی قوتیں ہنگامہ رکھنے والی طبائع میں جا گزیں ہوئی ہیں اور اس طرح اسلام کا چمن خزاں آشنا ہوا ہے اور اسی نے کارواں والوں کو مدہوش کر کے متاعِ کارواں کے لٹ جانے کے سامان پیدا کیے ہیں۔ اس موضوع پر جناب مجدد کے خیالات کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں[1]" مجدد صاحب ایک جگہ صاف صاف فرماتے ہیں "اللہ کے لیے وجود ثابت ہے اور ممکن کے لیے عدم۔ تاکہ تمام کمال حق تعالیٰ سے راجع ہو اور تمام

[1] حیات مجدد ص ۱۳۲

شر و نقص ممکن کی جانب ہو سکے ممکن کے لیے وجود ثابت کرنا اور تمام خیر و کمال کو اس سے منسوب کرنا حق تعالیٰ کے ملک میں اس کو شریک کرنا ہے۔ اسی طرح ممکن کو حق تعالیٰ کا عین کہنا اور ممکن کے صفات و افعال کو واجب کے صفات و افعال کا عین بنانا بڑی بے ادبی اور اس کی صفات کے حق میں الحاد و شرک ہے[۱]"

ترویج شریعت کے بارے میں بھی مجدد صاحب مغفور کی بڑی خدمات ہیں جن کا تفصیلی ذکر یہاں ممکن نہیں۔ اپنے اس امر کے لیے علماء اور امراء کو پوری کوشش سے بیدار کیا۔ مثلاً ایک جگہ مکتوبات میں فرماتے ہیں "اب صرف یہی آرزو ہے کہ نبی کریمؐ کی کوئی سنت زندہ ہو اور احوال و مواجید اہلِ ذوق کو ہی مبارک ہوں۔ جو لوگ شریعت کو پوست خیال کرتے ہیں اور حقیقت کو مغز کہتے ہیں وہ اصل معاملہ سے بے خبر ہیں اور صوفیا کی بیہودہ باتوں پر مغرور اور مقامات و احوال پر دل لگائے بیٹھے ہیں۔ ... آنحضرتؐ کا طریقہ صراطِ مستقیم ہے اور اس کے سوا راستے ٹیڑھے ہیں۔ باطن ظاہر کو پورا کرنے والا ہے اور بال برابر بھی ایک دوسرے سے مخالف نہیں ہیں۔ مثلاً زبان سے جھوٹ نہ بولنا شریعت ہے اور دل سے جھوٹ کا خطرہ دُور کرنا طریقت اور حقیقت ہے[۲]"

مسئلہ قضا و قدر دنیا کا بڑا اہم مسئلہ ہے اور ہر مفکر نے اپنی بساط کے مطابق گرہ کشائی کی ہے اور اکثر افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں، کوئی قدر کی طرف ضرورت سے زیادہ جھک گیا کوئی جبر کی طرف زیادہ مائل ہو گیا۔ دراصل صحیح راستہ درمیان کا ہی ہے۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں "مسئلہ جبر و قدر میں اکثر لوگ حیران اور گمراہ ہو رہے ہیں بعض کہتے ہیں کہ بندے سے فعل اس کے اپنے اختیار سے صادر ہوتا ہے بعض اس میں جبر کے قائل ہیں۔ گویا ان دونوں گروہوں نے اعتدال اور میانہ روی کو ترک کر کے افراط و تفریط کو اختیار کیا ہے۔ بعض نے اعتقاد میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے جسے صراطِ مستقیم کہا جا سکتا ہے

۱؎ ایضاً ص ۱۳۲ ۲؎ ایضاً ص ۶۲ - ۱۶۱ ۳؎ ایضاً ص ۲۱۷

عہدِ اکبری میں بادشاہِ وقت کے خلاف اور امراء و وزراء کے علی الرغم جہاد کرنا اور حق بات کا اعلان کرنا آپ ہی کا کام تھا۔ اکبر تقریبًا ہندو ہو گیا تھا اور اسلام کے علاوہ ہر مذہب کو برداشت کر لیتا تھا۔ اسلام کے نام سے اُسے چڑ سی ہو گئی تھی۔ خود کو باقاعدہ سجدہ کراتا تھا۔ جہانگیر بھی مذہب کے معاملہ میں اکبر سے کچھ ہی بہتر تھا۔ اس نے دربار میں بلا کر سجدہ کرنے کا حکم دیا لیکن مجدد صاحب نے صاف انکار کر دیا اور نتیجہ کے طور پر آپ کو گوالیار کے قلعہ میں ایک سال تک قید رہنا پڑا۔ اکبر ہر قیمت پر اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ علماءِ سُوء اس کی ہر حماقت کو جائز قرار دیتے اور انعام و اکرام حاصل کرتے۔ علمائے ربانی پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ عام مسلمان سخت اذیت میں مبتلا تھے۔ کافر علی الاعلان اسلام اور مسلمانوں سے استہزاء کرتے تھے۔ اسی طرح جہانگیر نے بھی کسی خلافِ شرع رسم کو منسوخ نہیں کیا۔ ایسی حالت میں عین دربارِ جہانگیری میں اعلانِ حق کرنا اور اسکی مرضی کے خلاف اسلامی تعلیمات کی وضاحت کرنا بڑی جرأت کا کام تھا۔ خاص طور پر اس زمانہ میں جب کہ عام علماء اور مشائخ نے ایک گوشہ میں بیٹھ جانا ہی سلامتی کا راستہ سمجھ لیا تھا آپ نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں۔ آپ کی اس نیک مثال نے لوگوں کو بہت جرأت دلائی۔ آپ نے مریدین کی بہت بڑی تعداد کو شریعت کی ترویج کے لیے تیار کر کے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بھیج دیا۔ مختلف مسلمان سربراہوں سے خط و کتابت کی اور ان سے ترویج شریعت کا مطالبہ کیا اور ان کو حقیقت سمجھانے کی کوشش کی۔ مغل دربار کے بہت سے امراء کو حلقۂ ارادت میں شامل کر کے ان سے کام لیا۔ یہ مجدد علیہ الرحمۃ کی خدماتِ جلیلہ کا ہی اعجاز ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ بابر کے اندر جس قدر دینی جذبہ موجود تھا، ہمایوں میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ تھا۔ اس کے بعد اکبر تو انحطاط کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجدد صاحب کی سعی میں خیر و برکت دی اور حالات کا رُخ بدلنے لگا۔ جہانگیر اکبر کی بہ نسبت دینی اعتبار سے غنیمت تھا، پھر شاہ جہان کے اندر دین کی محبت اور تڑپ کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ اور اورنگ زیب کی اسلام سے جو وابستگی ہے اُسے دنیا جانتی ہے۔ ہندوستان میں جس قدر دینی

تحریکات اٹھی ہیں اور مسلمانوں نے احیائے دین کے لیے جتنی کوششیں کی ہیں ان میں مجدد علیہ الرحمۃ کی سعیٔ مشکور کا بڑا دخل ہے۔

اللہ تعالیٰ فاضل مصنف کو جزائے خیر دے کہ اس نے اس خادم دین کی خدمات کو کتاب کی صورت میں مرتب فرمایا۔ کتاب اگرچہ عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پروف پڑھنے کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جا سکا اس لیے جا بجا اغلاط نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں زبان بھی کھٹکتی ہے۔

ہفت روزہ شہاب | زیر ادارت: جناب نعیم صدیقی صاحب و جناب کوثر نیازی صاحب سالانہ چندہ ۱۵ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے خصوصی نمبر ۱۲ آنے پتہ ۱۵۔ اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

نعیم صدیقی صاحب اور کوثر نیازی صاحب علمی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیتیں ہیں۔ دونوں دین کے مخلص خادم ہونے کے علاوہ علم و ادب میں بھی نہایت اونچا مقام رکھتے ہیں نعیم صاحب کافی عرصے سے خاموش تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کے قلم نے سکوت توڑ کر اب اپنے چاہنے والوں سے خطاب کرنا شروع کیا ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر اس مجلہ کا خصوصی نمبر ہے۔ فہرست پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے نامور اصحاب فکر شریک بزم ہیں۔ مثلاً مولانا مودودی مولانا غلام رسول مہر، میاں بشیر احمد صاحب، پروفیسر حمید احمد خاں، چوہدری نذیر احمد، مولانا عبدالستار خاں نیازی اور پروفیسر محمد رفیق۔ حصۂ نظم میں ماہر القادری، احسان دانش، اثر صہبائی اور خود ترتیب دینے والوں کے نام ملتے ہیں۔ اس رسالے میں سب سے مفید اور وقیع مضمون مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تقریر ہے جو موصوف نے مینارڈ ہال میں کی تھی۔ اتحاد اسلامی کے سلسلہ میں میاں بشیر احمد صاحب، پروفیسر حمید احمد خاں اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے خیالات نہایت مفید اور معلومات افزا ہیں۔

حصۂ نظم میں احسان دانش کی غزل خوب ہے اور ایک ایک مصرعہ سے کہنہ مشقی کا اظہار ہوتا ہے ؎

خدا جو بن گئے وہ بندگی کے بھی نہ رہے
بشر حدودِ بشر میں رہے تو اچھا ہے

اس کے علاوہ اثر صہبائی کی نظم 'نور و نکہت' بڑی دلکش ہے۔ نعیم صاحب کی نظم 'اے نیل کی موجو!' ان کے مخصوص رنگ میں نہایت زوردار ہے۔ کوثر نیازی صاحب کی غزل 'مل کو ٹوٹتا ہوں تو العنت بھی کم نہیں' خاصی کامیاب ہے۔ ماہر القادری کی نظم 'پیام و تمنا' جوش ایمان اور غیرتِ دین کا بہترین مظہر ہے۔

شہاب کے اندر جس قدر مقالات شائع ہو رہے ہیں اُن میں سے اکثر بلند پایہ ہیں۔ اور ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نعیم صاحب اور کوثر صاحب کی تحریروں کا فاضلانہ لب و لہجہ اور حکیمانہ اسلوبِ بیان اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی اور عسکرانہ رجز خوانی نے مجلّہ کو عقل و جذبہ کا ایک حسین مرقع بنا دیا ہے۔

سرورق دیدہ زیب ہے۔ البتہ کتابت کا معیار اور زیادہ بلند کرنے کی ضرورت ہے۔

(بقیہ اشارات)

گزشتہ صفحات میں ہم نے نوعِ بشری کی جن الجھنوں کا ذکر کیا ہے اُن پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ ان کے وجوہ و اسباب کیا ہیں۔ ہم اس معاملہ پر جس قدر غور و فکر کرتے ہیں ہمیں ان کی بنیادی وجہ صرف ایک ہی معلوم ہوتی ہے کہ سائنس نے اپنے حدود کو نہیں پہچانا اور اس نے ان امور میں بھی دخل دینے کی جسارت کی ہے جو اس کے دائرۂ اختیار سے یکسر باہر ہیں۔ سائنس کا تعلق ان چیزوں سے ہے جنہیں دیکھا اور سنا جا سکتا ہے، جن کا وزن کرنا ممکن ہے یا جن کی پیمائش ہو سکتی ہے۔ لیکن جب ہم نظامِ کائنات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اس امر کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ اُن اشیاء کے علاوہ جو حواس کی گرفت میں آسکیں، یہاں بعض ایسی حقیقتیں بھی موجود ہیں جن سے کسی صورت بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر یہ کائنات صرف اسباب و اثرات کا ایک وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے اور قوانینِ طبعی کا پابند ہے تو پھر ہمارے دل میں اس کائنات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اُس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کی خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے جس کے مانے بغیر خود ہمارا وجود ہستی کی وسعتوں میں ہمیں بے معنی سا دکھائی دیتا ہے۔ جب میں کیلسیم، ہائیڈروجن، اور اسی قسم کی بے جان چیزوں کا پیکر ہوں تو پھر میں حیران ہوں کہ میرے اندر غیر محدود اور لا متناہی حقیقتوں کو سمجھنے کا جذبہ کیوں تڑپتا ہے تاکہ میں ان کی معرفت حاصل کر کے یقین و ایمان کے اُن لازوال خزانوں سے بہرہ مند ہوں جو میری صحیح اور متوازن نشو و نما کے ضامن ہیں۔

سائنس مجھے محسوس چیزوں کے خواص سے تو آشنا کرتی ہے مگر مجھے یہ نہیں بتاتی کہ آخر مجھے اور اس ساری کائنات کو پیدا کیوں کیا گیا۔ میرا دل اپنی زندگی اور اس کائنات کے وجود کے مقاصد معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ بیتاب رہتا ہے لیکن سائنس اس معاملہ میں میری کوئی رہنمائی نہیں کرتی۔ وہ مجھے صرف یہ کہہ کر خاموش کرانا چاہتی ہے کہ میری حیات عناصر میں ظہورِ ترتیب کا نتیجہ ہے۔ اس جواب کو بھی سن کر میری الجھن دور نہیں ہوتی۔ میرا ذہن پھر یہ سوچنے

لگتا ہے کہ آخر ان عناصر کو ترتیب کس نے دیا اور کیوں دیا۔ اس کے مقاصد کیا تھے۔ میرے اس سوال پر سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ علت و معلول کی کرشمہ سازی ہے لیکن میں علت و معلول کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود بھی اُس ہاتھ کو جاننے کا آرزو مند ہوں جس نے علت و معلول کی اس ڈوری کو سب سے پہلے حرکت دی۔ اس پر مجھے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فریضہ بخت و اتفاق نے سرانجام دیا۔ چلیے میں نے یہ بھی مانا کہ یہ سارے مظاہر کائنات اتفاق کی ٹھوکر کے رہین منت ہیں لیکن یہاں بھی میری تشفی نہیں ہوتی۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر یہ ساری کائنات محض اتفاق کی آفریدہ ہے تو پھر غیر معین توانائی اور اتفاقی حادثات سے معین مظاہر کیسے معرض وجود میں آگئے اور میرے اندر اس بات کا شعور کس طرح پیدا ہو گیا کہ میں ایک مقصد کو سامنے رکھ کر عالم طبیعی اور اس کی قوتوں کو مسخر کروں۔ میری یہ وہ الجھنیں ہیں جو سائنس کبھی سلجھا نہیں سکتی۔ ان کو صرف مذہب ہی دور کر سکتا ہے۔ سائنس نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ ایسے پھٹے میں اڑا لی جس کا اُس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس حقیقت کا بڑے بڑے نامور سائنس والوں تک نے آج اعتراف کیا ہے۔

سیولی وان اپنی تالیف سائنس کی حدود و قیود پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس کائنات کی سائنسی توجیہ اُس صورت میں صحیح معلوم ہوتی ہے جب اس کا تعلق بے جان مادے سے ہو۔ مثلاً سائنس سیاروں کی زندگی، ان کے مقام، حجم اور رفتارِ گردش کے بارے میں تو کسی حد تک صحیح صحیح معلومات فراہم کر سکتی ہے لیکن جب ہم انسانی زندگی کے متعلق سائنس کی تصریحات کا ملاحظہ کرتے ہیں تو صورتِ حال کچھ زیادہ تسلی بخش نظر نہیں آتی۔ سائنس حیاتِ انسانی کے بعض بنیادی سوالات کے بارے میں قطعاً خاموش ہے۔ اگر ہم بالفرض انسانی افعال و اعمال کو طبیعی اور کیمیاوی تبدیلیوں کا نتیجہ بھی سمجھ لیں تو پھر بھی ایک سوال اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے کہ آخر ان تغیرات کے پیچھے کونسا مقصد کارفرما تھا۔ لیکن مقصد کا تعین تو سائنس کے دائرہ سے باہر ہے۔"

سیولی وان نے مقصد کے تعین کے سلسلے میں سائنس کی درماندگی کا بڑا حقیقت پسندانہ اعتراف

کیا ہے۔ انسانی اعمال کے محرک اور اُن کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ سائنس کی طرح انہیں سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اسی وقت قائم ہوتا ہے جب اُن کے احوال و اسباب کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں سائنس کی سی بے لوثی اور غیر جانبداری کبھی نہیں آسکتی۔ اس لیے انسان فطری طور پر اس بات کا محتاج ہے کہ وہ ایک ایسے نظام حیات کو قبول کرے جس کی اساس نہ تو حسّی و عقلی ہو اور نہ ہی کسی فرد، گروہ، قوم یا پوری نوع بشری کے مادی مطالبات بلکہ اس کا منبع و ماخذ وہ ذات باری ہو جو اقتدار کا سرچشمہ ہے اور جس کو تسلیم کیے بغیر ایک طرف تو انسانی زندگی انتشار میں مبتلا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف فطرت کی ابتدا و انتہا کا مسئلہ ایک لاینحل معمہ بن جاتا ہے۔

رستم و سہراب کے جس قصّے سے ہم نے اپنی گزارشات کا آغاز کیا ہے، اُن کے حال سے تین شخص واقف تھے، ایک سہراب کا ماموں ژندہ ازم، دوسرا ہجیر، تیسرا کیکاؤس لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے۔ اسی طرح کی تین قوتیں سائنس اور مذہب کی مصالحت میں حائل ہیں یعنی جہالت، مخالفتِ حق اور نفسانیت۔ ہمیں امید ہے کہ اگر یہ تینوں قوتیں آج بھی راستے سے ہٹ جائیں تو سائنس اور مذہب آپس میں جلد ہی گلے مل جائیں گے۔ سائنس اپنی حدود کو پہچان کر فوراً ہی اپنے آپ کو مذہب کے سپرد کر دیگی اور مذہب سائنس کی فراہم کردہ قوتوں کو کام میں لا کر ایک بہتر اور شادکام زندگی کی بنیاد رکھے گا۔ انسان کو اُس جسمانی و دماغی اور روحانی منزل تک پہنچنے کے لیے جس کی طرف فطرت کی خاموش نگاہیں اشارہ کر رہی ہیں، ایک ایسے دین کی ضرورت ہے جو انسان کے نفسیاتی اور روحانی مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ سائنس کی عظیم الشان ایجادات و اکتشافات سے بھی کام لینے کی پوری قدرت رکھتا ہو۔

خـــالی صفحـــه

مطبوعات اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

تصنیفات سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱- اسلام اور جدید معاشی نظریات
مجلد مع گرد پوشی ۴/۴

۲- پردہ ,, ۳/-

۳- حقوق الزوجین ,, ۲/-

۴- خطبات ,, ۴/۴

۵- رسالہ دینیات ,, ۲/۸

۶- سلاجقہ ,, ۳/۸

۷- اسلامی قانون اور پاکستان میں
اسکے نفاذ کی عملی تدابیر ۱/-

۸- اسلامی دستور کی تدوین ۱/-

۹- سلامتی کا راستہ ,, -/۶/۶

۱۰- اسلام اور جاہلیت ,, -/۱۰/-

۱۱- اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر -/۱۰/-

۱۲- انسان کا معاشی مسئلہ اور اس
کا اسلامی حل -/۱۰/-

۱۳- توحید و رسالت اور زندگی بعد موت
کا عقلی ثبوت -/۱۲/۶

۱- ٹوورڈس انڈرسٹینڈنگ اسلام
بالکل نیا ترجمہ رسالہ دینیات
از پروفیسر خورشید احمد
ایم اے - ایل ایل بی ۳/۸/-

۱۵- اسلامی تہذیب اور اس کے
اصول و مبادی زیر طبع

۱۶- تنقیحات ,,

افضل حسین ایم - اے- ایل - ٹی :

۱۷- اخلاقی کہانیاں حصہ اول -/۶/۶

۱۸- اخلاقی کہانیاں حصہ دوم -/۶/۶

۱۹- ,, سوم -/۱۰/-

۲۰- ,, چہارم -/۱۰/-

محمد عبدالحی :-

۲۱- داعی اسلام کی حیات طیبہ ۳/۸/-

۲۲- نبیوں کے حالات حصہ اول -/۶/۶

۲۳- ,, دوم -/۱۰/-

۲۴- ,, سوم -/۱۰/-

۲۵- ,, چہارم ۱/۴/-

چوہدری بہاول خاں ناگرہ صاحب :-

۲۶- اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام ۱/۶/-

بچوں کی خاص کتابیں :-

۲۷- قاعدہ ہماری کتاب -/۱۰/-

۲۸- ہماری کتاب اول -/۱۲/-

۲۹- ,, دوم ۱/-/-

۳۰- ,, سوم ۱/۴/-

۳۱- ,, چہارم /۶/-

۳۲- ,, پنجم ۱/۶/-

اپنی فرمائشیں حسب ذیل پتہ پر ارسال فرمائیے۔

اسلامک پبلیکیشنز - ۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور